اجنبی مسافر، اداس شاعر
(ناصر کاظمی: تحقیقی مطالعہ)
ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی

اجنبی مسافر، اداس شاعر

(ناصر کاظمی: تحقیقی مطالعہ)

ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی

بیکن بکس، گلگشت، ملتان

اجنبی مسافر، اداس شاعر

ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی

مظہر سلیم مجوکہ

نے

بیکن بکس گلگشت ملتان فون: 520790-91

کے لیے

شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کروائی

قیمت: 160 روپے

ٹائٹیل: جاذب، گرافکس ان لاہور

فون: 042-6363009

بہ اہتمام: سید اویس علی سہروردی

والدین، اہلیہ اور بچوں ...... زنیرہ فاروق
اور حسن فاروق کے نام

ترتیب

کہیں کہیں کوئی روشنی ہے

جو آتے جاتے سے پُوچھتی ہے

کہاں ہے وہ اجنبی مسافر

کہاں گیا وہ اُداس شاعر

(ناصر کاظمی)

کچھ اِس کتاب کے بارے میں

یہ کتاب میرے ایم۔ اے اُردو کے تحقیقی مقالے پر مبنی ہے۔ اسے بیس برس قبل شائع ہونا چاہئے تھا۔ اس تاخیر کے کئی اسباب ہیں' جن کا ذِکر اس وقت غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ اس عرصے میں ناصر کاظمی کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں شائع ہوگئیں۔ اس کے علاوہ ناصر کاظمی پر بہت سے مضامین اور کئی کتابیں بھی چھپ گئیں..........اِس کے باوجود اس کتاب کی اشاعت کو میں نے اس لئے ضروری خیال کیا کہ ناصر پر ابھی کام کرنے کی گنجائش موجود تھی' بالخصوص اس کی غزل کے معنوی اور فنی جائزے کا جواز ابھی موجود تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں اس پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے اور اس کا مطالعہ مختلف موضوعات کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ اس پہلو کو اس انداز میں اس سے پہلے کم کم نمایاں کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہوئے اختصار اور جامعیت کو بالخصوص پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ناصر کی شخصیت کے مطالعے میں صرف ان پہلوؤں اور گوشوں کو اُجاگر کیا گیا ہے جن سے اس کی شخصیت کا ایک واضح تاثر پیدا ہو سکے۔ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ بھی شامل کیا گیا ہے تاہم اس کی نثر کا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا۔ البتہ اس حوالے سے مختصر تاثرات پیش کئے گئے ہیں۔ میرے خیال میں ناصر کی شناخت کی اصل بنیاد اس کی غزل ہے۔ اس لئے اس کے تفصیلی تجزیے پر خاص توجہ دی گئی ہے اور اس کے معنوی اور فنی پہلوؤں کے بعض نئے گوشے بے نقاب کئے گئے ہیں۔ اردو شعر وادب میں ناصر کاظمی کے مقام و مرتبے کے تعین کے لئے اس کی غزل کو ہی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کے بارے میں میرے نقطۂ نظر سے شاید کسی کو اِختلاف ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی آراء کو زیادہ سے زیادہ معروضی بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ ناصر کی شخصیت اور فن کو درست تناظر میں دیکھا جا سکے۔ یوں اگر کتاب مجموعی طور پر ناصر کے بارے میں کوئی تاثر پیدا کرتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کاوش رائیگاں نہیں گئی۔

اس مطالعے میں مَیں نے جہاں جہاں ناصر کاظمی کے حوالے سے اس سے قبل چھپنے والی کتابوں اور دیگر ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔ ان کا دیانت داری سے حوالہ دیا ہے۔ تحقیق کے تقاضوں کے علاوہ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض چیزوں تک میری براہ راست رسائی نہیں تھی اور مجھے ان حوالوں پر انحصار کرنا پڑا۔ تاہم میں نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ اَپ ٹو ڈیٹ کیا جائے۔ چنانچہ اب یہ ایم اے کے تحقیقی مقالے سے بہت مختلف ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں کئی اہلِ دانش اور احباب کے مشورے شامل رہے ہیں۔ ان میں میرے اساتذہ میں پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد اور پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری اور احباب میں علمدار حسین بخاری اور قاضی عابد شامل ہیں۔ میں پروفیسر ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کتاب کے مسودے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس کے معنوی پہلوؤں کو بہتر بنانے کے علاوہ زبان وبیان کے حوالے سے مفید مشوروں سے نوازا۔ میں اپنے دوست قاضی اعجاز محور کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب کے ٹائیٹل کے لئے ناصر کاظمی کی تصویر بنائی۔ بیکن بکس ملتان کے عبدالجبار صاحب بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جن کے تعاون سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اس کام کی تکمیل کے لئے اپنے والد محترم اور بھائیوں سید خالد جاوید مشہدی، سید محمد اسحاق مشہدی اور سید طارق جاوید مشہدی کی طرف سے مسلسل میری حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ان سب کے علاوہ میں اپنی اہلیہ اور بچوں زنیرہ اور حسن کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ میں یہ کام مکمل کر سکوں۔ میں نے ان کے حصے کا بہت سا وقت اس کتاب پر صرف کیا۔

(ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی)
شعبۂ تعلیم، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی
ملتان

[illegible]مبر 2000ء

باب اول

آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے

(ناصر کاظمی کی شخصیت)

شعر وادب کے حوالے سے کئی اور سوالات کی طرح یہ سوال بھی ہمیشہ سے بڑا اہم رہا ہے کہ کسی فن پارے کو فن کار کی شخصیت کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جائے یا دونوں کو الگ الگ خانوں مین رکھ کر دیکھا جائے۔ اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ کیا فن پارے کی تفہیم وتشریح میں فنکار کی شخصیت کا مطالعہ معاون ہو سکتا ہے یا نہیں...... بہر حال کسی فن پارے کا مطالعہ صحیح طور پر فنکار کی شخصیت کے تناظر میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ شاعر یا ادیب جس تخلیقی سطح پر جی رہا ہوتا ہے اس کا انعکاس اس کے ادب پارے یا فن پارے میں' بالعموم ہوتا ہے' کبھی بالواسطہ طور پر اور کبھی بلاواسطہ طور پر۔ حالات وواقعات اور مشاہدات و تجربات کی ایک دنیا ہوتی ہے جو فنکار کے گرد وپیش پھیلی ہوتی ہے جس کے اثرات لازماً اسکی شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ شدتِ احساس رکھنے کے سبب سے شاعر یا ادیب زیادہ شدت کے ساتھ ان اثرات کو قبول کرتا ہے اور ان اثرات کا تخلیقی اظہار شعر وادب کے وسیلے سے کرتا ہے۔

ان باتوں کے مختصراً تذکرے کی روشنی میں ناصر کاظمی کی شاعری کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کے مطالعے کا جواز ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ویسے ناصر کے

حوالے سے تو یہ ناگزیر محسوس ہوتا ہے کہ اس کی شاعری اور شخصیت کو ایک ساتھ رکھ کر مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے کہ اس کی زندگی اور شاعری میں کوئی خاص فاصلہ نہ تھا۔ جو عوامل وعناصر اس کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں، کم وبیش وہی اس کی شاعری میں جھلکتے ہیں۔ اس کی شاعری اور زندگی ایک جیسی محسوس ہوتی ہے۔ تبھی تو ناصر کاظمی کے ایک انتہائی قریبی دوست اور مشہور ادیب وافسانہ نویس انتظار حسین نے کہا ہے کہ:

> "اس نے زندگی اور شاعری کو گڈمڈ کر رکھا تھا' وہ شعر کہتا ہی نہیں' جیتا بھی تھا"۔ (1)

ناصر کاظمی کے ایک اور دوست احمد عقیل روبی نے بھی یہی بات کہی ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت باہم یوں پیوست تھیں کہ انہیں الگ کرنا دشوار ہے۔

> "ان کی شخصیت اور شاعری ایک دوسرے سے بری طرح لپٹے ہوئے ہیں جو اُداسی اور خوشگوار غم کی کیفیت ناصر کے شعر میں ہے وہی ان کی شخصیت میں نمایاں تھی۔ اُداسی شعر میں آتی تو ان کے گھر کی دیواروں پر بال کھول کر سوتی تھی۔ یہی اُداسی ناصر کاظمی کی خشک آنکھوں میں بھی بکھری نظر آتی تھی"۔ (2)

تاہم ناصر کے ایک اور دوست شیخ صلاح الدین نے اس امر سے اختلاف کیا ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری اور شخصیت میں کوئی فاصلہ نہ تھا' بلکہ انہیں اصرار ہے کہ

> "اس (ناصر کاظمی) نے اپنی انسانی زندگی کی پرچھائیں تک اپنی شاعری پر نہ پڑنے دی .... اس کی داخلی یا خارجی زندگی کا اندازہ اس کی شاعری سے لگانا ناممکن ہے"۔ (3)

بہر صورت' ناصر کے احوالِ حیات پر ایک نظر ڈالیں اور اس کی شاعری کا تجزیہ کریں تو انتظار حسین کی بات زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتی ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ناصر تخلیقی سطح پر جینے والا ایک شاعر ہے۔ جس کی شاعری اس کی شخصیت کا تخلیقی اظہار ہے اور شخصیت شاعری کا ایک عکس۔ تاہم اس کی شخصیت کے حوالے سے گفتگو کرنا یا کچھ تحریر کرنا آسان نہیں بالخصوص اس صورت میں جب بات کرنے والا یا تحریر کرنے والا ناصر سے ملا نہ ہو۔ اس کے سامنے صرف ناصر کے دوستوں اور جاننے والوں کی تحریریں ہوں یا ان سے وہ ملا ہو۔ یوں اس اعتراف کے ساتھ ناصر کی شخصیت پر قلم اٹھانا کارِ دشوار ہے تاہم ناصر کی شخصیت کے ارد گرد کچھ ایسا تحیر اور اسرار ہے کہ اس کو دریافت کرنا دلچسپ محسوس ہوتا ہے اور یہی دلچسپی محرک بنی کہ اس کی شخصیت پر کچھ لکھا جائے اور پھر اس کے ذریعے اس کے شعری تجربوں کی معنویت تلاش کی جائے اور اس کے علاوہ ناصر کاظمی کو صحیح طور پر سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔

ناصر کاظمی کا پورا نام سید ناصر رضا کاظمی تھا۔ 8 دسمبر 1925ء کو انبالے میں پیدا ہوئے۔ (4) اپنے وطن مالوف اور اپنے خاندان کا تذکرہ ناصر نے بڑی محبت کے ساتھ کیا ہے۔

"انبالہ ایک شہر تھا' سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

وہاں میں نے جنم لیا' ایک چھوٹا سا معاشرہ تھا۔ ہمارا گھر پرندوں' یادوں' بچوں' پھولوں' درختوں اور ننھی منھی پیچ در پیچ گلیوں کا معاشرہ تھا۔ اس میں سب لوگ امیر'

غریب بڑے سکھ اور امن سے رہتے تھے۔ لیکن ایک عجیب بات تھی اس معاشرے میں جو کہ بظاہر غریب نھنے منے لوگ تھے۔ انکی عزت بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ بڑے لوگوں کی۔ بلکہ شاید ان سے زیادہ"۔(5)

"میرے دادا سید شریف الحسن پولیس انسپکٹر تھے اور نصیر پورہ، مگر پورہ اور راج گڑھ کے بہت بڑے زمیندار تھے اور انبالہ کے چند نامور رئیسوں میں سے تھے۔ میرے والد سید محمد سلطان نے بی اے تک تعلیم اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی۔ نائب تحصیلدار اور سب انسپکٹر بھی رہے لیکن ملازمت کی طرف سے ان کا دل اچاٹ تھا۔ نہایت ہی نمازی، عابد شب زندہ دار، مخلص اور ایماندار تھے"۔(6)

ناصر کی شاعری اور زندگی میں ناسٹلجیا کا حوالہ بڑا بامعنی ہے۔ اس کے ہاں یادوں کا ایک سلسلہ ہے جو دور بچپن ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ یادوں کی نوعیت وقت کے ساتھ بدلتی رہی، لیکن یادوں سے ناصر کا ذہنی رابطہ کبھی منقطع نہ ہوا۔ اس کی شاعری میں یاد کے حوالے سے بڑے بامعنی مضامین ہیں۔ یادوں کا ایک معاملہ اس کی شخصیت کے ساتھ بھی ہے بلکہ یہ اس کی شخصیت ہی کا ایک پہلو ہے جو شاعری میں عکس ریز ہے۔ اپنے بچپن کی یادیں بھی، بقول ناصر کے اس کا راستہ روکتی ہیں۔

"بچپن میرا۔۔۔ پاکستان آکر مجھے بہت یاد آتا رہا۔ لیکن تمہیں پتا ہے کہ یاد جو ہے انسان کی وہ مُو بہ مُو آتی ہے، یاد

انتخاب کرتی ہے، کچھ واقعات ایسے ہیں جو دوبارہ بار بار آکر
میرا راستہ روکتے ہیں اور حاضر بزم ہو جاتے ہیں"۔ (7)

انہی یادوں کے بیان میں ناصر نے اپنے بچپن کے دیگر مشاغل کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے مطابق گھڑ سواری، شکار کھیلنا، دیہات میں پھرنا، دریاؤں کی سیر، پہاڑوں کی سیر اس کے پسندیدہ مشاغل تھے اور ناصر کے بقول یہی وہ زمانہ تھا جب اس کے ذہن نے فطرت سے محبت اور شاعری سے لگاؤ کے لئے نشوونما پائی۔

بچپن کی یادوں کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔

"بچپن میں دیوالی کے موقع پر ہم رنگ برنگی موم بتیاں جمع
کر کے پگھلا لیتے، پھر اس ہفت رنگ موم سے نئی بتیاں
بناتے، دیکھنے والا نہیں بتا سکتا کہ اس بتی میں کتنی قسم کا
موم ہے"۔ (8)

ناصر کو بچپن میں بے پناہ لاڈ پیار ملا، گھر میں خوشحالی تھی، نوکر چاکر بھی تھے، غرض ایک طرح کا شاہانہ انداز تھا۔ خود ناصر کے بقول اس کا بچپن شہزادوں کی طرح گزرا۔ اس لاڈ پیار نے ناصر کو بہت ضدی بنا دیا۔ ان کے صاحبزادے باصر سلطان کاظمی نے بتایا کہ ان کے والد اپنی بات پر اڑ جاتے تھے اور جب ان کی بات بالآخر مان لی جاتی تو وہ ایک گونہ عافیت محسوس کرتے تھے۔ ضد اور اپنی بات پر اڑ جانے کا یہ انداز بچپن سے شروع ہوا تو آخری عمر تک رہا۔ وہ خود کہتے ہیں۔

"میں بچپن ہی سے بڑا ضدی تھا اور آج تک اس ضد نے
پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے اپنی ضد کو کبھی نہیں دبایا۔
کبھی چاہنے والے زندہ تھے تو میری ضد بھی پوری کرتے

تھے ...... اور اب یہ دُنیا!خدا جانے ابھی کیا دیکھنا ہے اور

میری مٹی کہاں کی ہے"۔(9)

دیکھا گیا ہے کہ جن گھروں میں بچوں کو لاڈ پیار کے وافر مواقع میسر آتے ہیں وہاں بچے بالعموم جزئیات و تفصیلات کے خوگر نہیں بن سکتے بلکہ ان کی نظر اشیاء کی سطح سے گذر جاتی ہے۔ لیکن ناصر شہزادوں کی طرح رہتے ہوئے بھی بے حد حساس بچہ تھا۔ تجسس اور غور و فکر کا مادہ اس میں شروع سے ہی موجود تھا۔ (10)

ناصر کے مزاج میں بے پناہ ضد اور اپنی باتوں پر اڑ جانے کے رویے ہی کے سبب سے غالباً اس کے ہاں انکسار کی کمی کا احساس ہوتا ہے وہ کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔

اپنی ابتدائی تعلیم اور تربیت کے حوالے سے ناصر نے جو کچھ اپنی تحریروں میں بیان ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سکول کی رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے گھر میں بھی تعلیم و تربیت کے مواقع میسر آئے۔

"میں نے پانچویں جماعت تک مشن گرلز اسکول میں اور باقی والدہ مرحومہ کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی۔ 12 برس کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ 13 برس کی عمر میں "گلستان" "بوستان"۔ "شاہنامہ فردوسی"۔ "قصہ چہار درویش"۔ "فسانۂ آزاد"۔ "الف لیلہ"۔ صرف و نحو اور شاعری کی دیگر کتابیں ختم کرلیں۔ پانچویں اور چھٹی جماعت میں نے نیشنل ہائی سکول پشاور سے پاس کی۔ پشاور میں وزیر باغ، شاہی باغ، قلعہ اکبر میری پسندیدہ سیر گاہیں تھیں......

شاعری مجھے اپنے نانا سید نیاز نبی مرحوم اور والدہ محترمہ
کنیزہ محمدی بیگم سے ورثے میں ملی"۔(11)

مزید تعلیم کے حصول کے لئے ناصر کاظمی لاہور آگئے۔ لاہور میں قیام کے دوران ہی ناصر نے اپنے وہ شاہانہ اطوار بر قرار رکھے جو بچپن سے انہیں میسر تھے۔ ہوسٹل میں وہ الگ کمرے میں رہتے تھے' جہاں انہوں نے اپنا الگ ملازم رکھا ہوا تھا۔ خوش پوشی اور خوش خوراکی ہمیشہ کی طرح اب بھی مرغوب تھی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' ناصر کاظمی کی شاعری کے لئے زمین تو قدرتی طور پر اور موروثی طور پر پہلے ہی سے ہموار تھی' یعنی گھر کا ماحول شعر و شاعری اور علم و فن سے دلچسپی کا تھا۔ اس پہلو کے ساتھ ساتھ جس عنصر نے ناصر کے لئے ایک طرح کی ادبی اور شعری تربیت میں اہم کردار ادا کیا وہ اس کے عہد کی سیاسی اور ادبی فضا تھی۔ اس سیاسی اور ادبی فضا کے اولین برگ و بار اس وقت پھوٹتے ہیں جب 1857ء کے بعد کے ذہنی اور علمی ویرانے میں (بالخصوص مسلمانوں کے حوالے سے) سرسید نے اپنی اصلاحی اور تجدیدی تحریک کے دیئے روشن کیے۔ اس تحریک کے وسیلے سے سرسید مسلمانوں کی ہمہ گیر اصلاح اور رہنمائی کا بیڑا لے کر اٹھے تھے چونکہ ان کے پیش نظر اصلاح احوال کا ایک منصوبہ تھا' اس لیے انہوں نے شعر و ادب میں ایسے رجحانات پرزور دیا جن میں مقصدیت اور افادیت کے پہلو نمایاں تھے۔ تحریر میں سادگی کا اجتہاد مرزا غالب اپنے خطوط کے وسیلے سے کر گئے تھے' سرسید نے اس رجحان کا رخ مقصدیت کی جانب موڑ دیا۔ مقصدیت اور افادیت کے انہی اثرات کے تحت سرسید کے ایک معتمد ساتھی الطاف حسین حالی نے مقصدی شاعری شروع کی۔ اصلاحی اور مقصدی شاعری کا ایک روشن نقطہ آگے چل کر اقبال کی صورت میں سامنے آیا۔ اس تحریک کی ایک ترقی یافتہ شکل

(قدرے بدلے انداز میں) ترقی پسند تحریک تھی' جس نے اردو شعروادب میں نئی معنویتوں کے راستے وا کیے۔

محمد حسین آزاد نے لاہور میں انجمنِ پنجاب کے زیر اہتمام باقاعدہ نظم گوئی شروع کی۔ یہ شعوری کوشش بھی شعروادب کے سفر کا ایک روشن یا نیم روشن سنگِ میل قرار دی جا سکتی ہے۔ حالی کی مقصدی شاعری اور آزاد کی "شعوری نظم گوئی" کے بعد ایک بڑا اور بامعنی' حوالہ تصدق حسین خالد' میراجی اور ن۔م۔ راشد کے وہ تجربے تھے جو انہوں نے آزاد نظم کے حوالے سے شروع کئے۔ میراجی نے لفظوں کے ذریعے ابہام پیدا کر کے ایک نیا اسلوبِ اظہار اختیار کیا اور ن۔م۔راشد نے کچھ لگے بندھے شعری ڈھانچوں سے بغاوت کر کے اپنے تجربے کو معنویت دی۔ انہی تجربوں میں ساتھ ساتھ نظم معرّیٰ کا چلن بھی عام ہو رہا تھا۔

یوں نظر آتا ہے کہ وہ زمانہ تبدیلیوں کی قبولیت کا زمانہ تھا۔ جس میں سیاسی' معاشرتی' معاشی اور ادبی وثقافتی تغیرات تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے تھے اور شاعروادیب ان تغیرات کے اثرات قبول کر رہے تھے ـــ ان رجحانات میں رومانیت بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

اس تناظر میں اگر ناصر کاظمی کے شعری مزاج کا تجزیہ کیا جائے تو وہ بڑی حد تک رومانوی نظر آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں انفرادیت پسندی' شدتِ احساس و تخیل اور فطرت پسندی ملتی ہے اور جذبات کے اظہار کی وہ شدت ہے جو اس عہد کا ایک عمومی رویہ تھا۔ تاہم اس تناظر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اپنے رومانوی رویے کے ساتھ روایت کے ساتھ ان کا ایک گہرا تعلق استوار تھا اور نئے شعری رویے بھی ان کے لئے دلچسپی کا سامان رکھتے تھے۔ وہ جب اسلامیہ کالج لاہور آئے تو یہاں شعروشاعری کا چرچا

تھا۔ وہ مزاجاً ماضی سے دلچسپی رکھنے والے انسان تھے۔ جس کے سبب سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری میں روایت کا گہرا اثر شامل ہے مگر ناصر نئے دور کے تقاضوں سے نہ تو بے خبر تھے اور نہ لاتعلق۔ ان کے ہاں روایت کا معاملہ شاعر کی انفرادی صلاحیت کے ساتھ مربوط ہے۔اس ضمن میں ناصر کی اپنی رائے کو دیکھنا مناسب ہو گا۔

"روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے۔ یعنی روایت وہ روح ہے جو کسی میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے...... زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنا نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے ستارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے"۔(12)

روایت کی روشنی میں اپنی انفرادی شعری صلاحیتوں کا یہی اثبات ناصر کی شعری زندگی کا ایک بڑا حوالہ ہے۔ پھر حفیظ ہوشیار پوری کی دوستی نے اس حوالے میں مزید توسیع پیدا کر دی، جس کے وسیلے سے ناصر نے شعر کی تربیت حاصل کی۔

"ظاہراً وہ کم ہی کسی سے اصلاح لیتے تھے اور نہ ہی کسی کو اپنا استاد ماننے کے روادار تھے...... لیکن مختلف صحبتوں میں بیٹھ کر کبھی نہ کبھی ان کے کسی نہ کسی شعر میں اگر اصلاح نہیں تو تبدیلی ہو جاتی تھی"۔(13)

انہی مختلف صحبتوں کے حوالے سے ناصر کاظمی کے ضمن میں دو باتیں اکثر

زیرِ بحث آتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا جدید شاعر کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے؟ اور اگر ناصر زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا تو کیا اس کے علم و فن کی بنیاد محض وہ صحبتیں ہیں جن میں بیٹھ کر اس نے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے کسبِ فیض کیا۔ دوسرے لفظوں میں کیا ناصر کا بیشتر علم سماعت کے وسیلے سے آیا؟ بات یہ ہے کہ ناصر کو اس بات کا احساس ضرور تھا کہ نئے شاعر کو اپنی شعری شناخت اور بقا کے لئے جدید علوم و فنون سے اور شعر و ادب کی مختلف عالمی تحریکوں سے آشنا ہونا چاہئے، مگر یہ کہنا محلِ نظر معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کو سارا علم ان صحبتوں سے ملا جن میں کچھ جدید شاعر تھے، کچھ فلسفی تھے اور کچھ دانشور تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ناصر نے اپنے دوستوں اور مہربانوں سے ان کی گفتگو کے وسیلے سے بہت کچھ سیکھا ہوگا، تاہم وہ بات بھی بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے جو ناصر کے دوست شیخ صلاح الدین (بہ حوالہ ناصر کاظمی ...... ایک دھیان) نے کی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناصر کو سارا علم و فن اس کے دوستوں مثلاً انتظار حسین، اختر محمود، غالب احمد، حنیف رامے، مظفر علی سید کے ذریعے بالعموم اور شیخ صاحب کے ذریعے بالخصوص میسر آیا۔ ممکن ہے، شیخ صاحب کا مقصد یہ نہ ہو مگر ان کے اندازِ بیان سے یہی محسوس ہوتا ہے۔

محفل آرائی ناصر کاظمی کی زندگی کا جزوِ لازم نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ زندگی میں صرف ہم خیال و ہم مشرب دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کی جائیں۔ ساری زندگی ایک چلتا راستہ ہو اور وہ اس پر دوستوں کے ساتھ چلتا جائے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ناصر کا بہترین تخلیقی زمانہ بھی وہی ہے جب اسے ایسے دن رات میسر تھے اور جوں جوں یہ دن رات ختم ہوتے گئے، اس کی تخلیقات کے بہترین دن رات بھی رخصت ہوتے گئے۔ شادی، ملازمتیں اور اس طرح کی دیگر پابندیوں نے اس کی

انجمن آرائی کی خواہش کو متاثر کیا۔ اس دکھ کا اظہار اس کے اشعار سے بھی ہوتا ہے' مثلاً بہت سے ایسے اشعار میں سے ایک شعر یوں ہے۔

بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں' کہاں ہیں وہ آدمی

اس محفل آرائی میں ناصر کی اپنی گفتگو اپنے اندر بے حد جاذبیت اور کشش رکھتی تھی۔ ایسی گفتگو جو سننے والوں پر سحر طاری کر دے۔ اس کو باتیں تخلیق کرنے کا خوب سلیقہ آتا تھا، اور پھر اس کے بیان میں حسن اور دلکشی ہوتی تھی۔ یہ حسن' دلکشی اور جادوگری رات کے آخری پہر خاص طور پر اپنا رنگ دکھاتی تھی۔

"جس طرح پتلیوں کا تماشا صرف رات کے پردے میں ہی ہو سکتا ہے' اسی طرح ناصر کاظمی کے لفظوں کے کھلونے شب کی سیاہی میں ہی حرکت میں آتے۔ وہ کیا کیا جادو جگاتا تھا' یہ وہی جانے جس نے اس کے ساتھ شب خیزی کی ہے"۔ (14)

ناصر کی خوبصورت گفتگو میں واقعہ اور تخیل کی آمیزش اس طور ہوتی تھی کہ دونوں کو الگ الگ کرنا دشوار تھا۔ یہی وہ ساحری تھی جو ہر ایک کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیتی تھی۔ انتظار حسین کے خیال میں اس کے ہاں واقعہ اور تخیل آپس میں اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش ہی بدمزگی نظر آتی ہے۔(15)

ناصر کے ایک اور دوست اسلم انصاری کے خیال میں بھی ناصر کاظمی کو واقعات اور کہانیاں تخلیق کرنے بلکہ گھڑنے میں خصوصی ملکہ حاصل تھا اور وہ یہ عمل اس قدر

خوبصورتی سے سرانجام دیتا تھا کہ اس میں سے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا دشوار ہوتا تھا۔ یہ ایک طرح کا تخلیقی عمل تھا جس کا دل آویز بیان اس کی گفتگو کو ساحری بنادیتا تھا۔

انسانی رشتوں کے معاملے میں شیخ صلاح الدین کے بقول (بہ حوالہ ناصر کاظمی، ایک دھیان) ناصر کاظمی برابری کا قائل تھا۔ وہ دوست احباب کا معاملہ ہو' یا میاں بیوی کے تعلقات ہوں یا اپنی اولاد کے ساتھ اس کا رشتہ ہو...... وہ ہر جگہ برابری کی فضا قائم رکھتا تھا۔ اس ضمن میں ان کے صاحبزادے باصر سلطان کاظمی نے ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کے والد سخت گیر باپ نہیں تھے' میں نے اکثر انہیں اپنا دوست ہی محسوس کیا وہ مجھ سے پوچھتے' "باصر! سگریٹ پیتے ہو"۔ میں جواب دیتا' "نہیں ابا جان"...... وہ پھر کہتے' "اگر پیتے ہو تو میرے خوف سے پینا بند نہ کرو"...... باصر نے یہ بھی بتایا کہ وہ امی پر بے جا پابندیوں کے قائل نہیں تھے' کبھی ان پر اپنی رائے نہ ٹھونستے' بلکہ جب امی نے ملازمت کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ (16)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناصر کا خمیر ہی آزادی سے اٹھا تھا' وہ ذہنی طور پر کسی بھی طرح کی پابندی کو قبول نہ کر سکتا تھا' یہی سبب ہے کہ جو بھی پابندی' خواہ وہ ازدواجی نوعیت کی ہو' کسی ملازمت کی وجہ سے ہو یا کسی اور طرح کی ہو' اس کے لئے تکلیف دہ ہوتی تھی۔ اس سے اس کی غیر ذمہ داری کا بھی شائبہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایسی بات بھی ہو تو صرف اس وجہ سے ہے کہ ناصر کا مزاج ہی پابندیوں کا باغی تھا' خواہ وہ کسی نوعیت کی ہوں

انسانی زندگی میں محبت کا تجربہ بے حد اہمیت رکھتا ہے' اردو شاعری اس تجربے کے رنگارنگ اظہار سے بھری پڑی ہے۔ اگرچہ اردو شاعری میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے تاہم گل وبلبل کے یہ افسانے اس میں سے خارج کر دیئے جائیں تو وہ یقیناً اپنے ایک اہم حصے سے محروم ہو جائے گی...... ناصر کاظمی کے ہاں بھی محبت کا موضوع جابجا

ملتا ہے۔ جس انداز اور اسلوب میں ناصر نے اس موضوع کو برتا ہے' اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ناصر زندگی میں محبت کے تجربوں سے گزرا تھا۔ اسکے دوستوں کے بقول ناصر نے ایک سے زیادہ محبتیں کیں، لیکن مجموعی طور پر ناکام رہا۔ ان کی شادی بھی البتہ ایک محبت کی شادی قرار دی جا سکتی ہے۔ محترمہ ناہید ندیم نے (بہ حوالہ ناصر کاظمی۔ شخصیت اور فن) حمیرا اور سلمٰی کے ناموں کی نشاندہی کی ہے جو غالباً ناصر کے اول اول کے تجرباتِ محبت کا مرکز تھے۔

ناصر کے دوستوں سے گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی سے محبت کر لینا ناصر کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کوئی بھی شخص (جو ناصر کو پسند ہو) کسی بھی وقت اس کی محبت کا مرکز بن سکتا تھا' اور وہ محبت اتنی ہی شدید ہو سکتی تھی' جتنی اس سے پہلے کسی سے ہوئی ہو گی۔ ناصر دراصل ہر شے میں حسن کا متلاشی تھا۔ اس لئے یہ خوبی اسے جس میں نظر آتی تھی، وہ اس کا محبوب بن سکتا تھا اور اس کا محبوب تو اس کا کوئی نوجوان دوست بھی ہو سکتا تھا۔

محبت کے ایسے گوناگوں تجربات کے زیر اثر ناصر کی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک ہمہ گیر قسم کی اداسی ملتی ہے۔ اس اداسی میں ناکامیوں کے رنگ بھی جھلکتے ہیں اور ہجر کے کرب کی شدت بھی' ناتمامی کا ایک گہرا احساس بھی ہے اور تنہائی کے مسلسل تجربات بھی...... اس کو اردو غزل کی روایت کا انداز کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ناصر نے یہ سب کچھ فیشن کے طور پر نہیں اپنایا، بلکہ اس کے اپنے تجربات کی دین ہے اور اس کی شخصیت کا حصہ ہے۔ محبت کے تجربوں کے ساتھ ساتھ ناصر کی شخصیت پر ہجرت کے تجربے کا گہرا اثر ہے۔ ہجرت اس کی شاعری پر ہی نہیں' اس کے وجود پر بھی وارد ہوئی ہے۔

"ناصر کی دیوانگی نے اس آشوب کے بطن سے جنم لیا تھا'
جس نے بہت سی بستیوں کو ویران کر دیا تھا اور بہت گھر
والوں کو بے گھر سے بے در بنا دیا تھا۔ ایک خلقت تھی کہ
رنج ہجرت کھینچ رہی تھی اور کتنے خانہ برباد تھے کہ یادوں
کے بجھے ہوئے سویرے آنکھوں میں چھپائے پھرتے تھے۔
ناصر کا زندگی کرنے کا طور اور شعری رویہ' دونوں کی
معنویت اسی سیاق و سباق میں کھلتی ہے"۔(17)

ملک کی تقسیم کے بعد ان دیاروں کو چھوڑ آنا جہاں ناصر چونچلوں اور لاڈ پیار کے سائے میں جوان ہوا تھا، بلاشبہ ایک سانحہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سانحہ یہ بھی ہے کہ نئے دیاروں میں خالی ہاتھ آنا پڑا۔ انبالے میں ناصر کے آباؤ اجداد کی جائیداد تھی' وہ سب کچھ وہیں رہ گیا...... پھر فسادات کے سانحے بھی ہم رکاب تھے۔ اس صورت حال کو ناصر نے خود اس طرح بیان کیا ہے۔

"پاکستان میں جب ہم آئے تو جس طرح دفتروں میں نہ
قلم تھا' نہ دوات تھی' نہ سٹیشنری' بے سروسامان' ہم بھی
بے سروسامان تھے"۔(18)

جو کچھ ناصر پیچھے چھوڑ آیا' اس میں اس کا شاندار بچپن تھا' نوجوانی کے کچھ افسانے تھے' کبوتر اور باغ تھے اور ایک خاص تہذیب و معاشرت تھی۔ یہ سب کچھ ناصر کو ہمیشہ شدت سے یاد آتا رہا اور اس کی شاعری میں ان یادوں کا بار بار اظہار ہوتا ہے۔

پاکستان آکر وہ شہزادوں کے سے اطوار قائم نہ رکھ سکا' جو بچپن سے اسے میسر تھے۔ اس کے علاوہ اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی آگئیں۔

"ادھر والد صاحب کی پنشن ہو گئی' گھر کا سامان کچھ ساتھ
نہ تھا' آخر فین روڈ پر ایک کوٹھی میں قیام کیا۔ پھر ملٹری
نے حکم دیا کہ یہ کوٹھی کسی افسر کو الاٹ ہو گئی ہے......
آخر پرانی انار کلی میں ایک مکان انکے تایا زاد بھائی نے دلوا
دیا...... جس طرح ہو سکا' ناصر کے والد نے گزارا
کیا"۔(19)

ایک ضدی' لاپرواہ' بے نیاز اور ہمیشہ آرام و آسائش کے لمحات میں گم رہنے والا نوجوان اب نامساعد ماحول میں گزارا کر رہا تھا اور یہ بلاشبہ ناصر کے لئے ایک بڑی تلخ حقیقت تھی جس کا اس کو سامنا تھا۔ لیکن ان تمام محرومیوں کے باوجود...... بقول ناصر کے۔

"......ایک بات اس میں تھی' اس بے سروسامانی میں ایک
جینے کی بڑی امنگ کہ ہم نئے ملک کے وارث ہیں"۔(20)

تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ ہجرت کے تجربے نے ناصر کو بے حد متاثر کیا۔ اس تجربے میں مقام اور وقت دونوں سے دوری کا احساس بیک وقت شامل تھا۔ یہی سبب ہے کہ اسے پرانی صحبتیں رہ رہ کر یاد آتی رہیں اور وہ پرانے دنوں کے خواب دیکھتا رہا، مگر اس حوالے سے ناصر کا مسئلہ وہ نہیں نظر آتا، جو قرۃ العین حیدر کا تھا کہ بچھڑے دیاروں کی سمت لوٹ جانے کا خیال آیا ہو۔ دراصل ایک شاندار ماضی سے الگ ہو کر ایک نئے معاشرتی نظام سے عدم مطابقت کا مسئلہ ہے جو ناصر کاظمی کو درپیش رہا اور یہ بھی ہجرت کے قریب ہی کا زمانہ ہے جب ناصر کاظمی کی غزل کا وہ رخ متعین ہوا جو اس کی حقیقی شناخت بنا۔ تجربے کی سچائی اور روح کے سچے کرب نے ناصر کی غزل کو مسیحائی کا سا

رنگ دے دیا، جس کے وسیلے سے اردو غزل کو بھی حیاتِ نو ملی۔

"ناصر کاظمی کی شاعری کی نشوونما 1947ء کے آس پاس ہوئی ہے اور اس زمانے میں ان کے ماحول کو جس آشوبِ قیامت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کی انہوں نے بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ زندگی اس زمانے میں جس طرح موت سے دوچار ہوئی ہے، رونقوں کا جس طرح خاتمہ ہوا ہے، بہاروں پر جس طرح خزاں آئی ہے، آشیاں جس طرح برباد ہوئے...... اس کو ناصر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ" (21)

جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے ناصر کاظمی نے ملازمتیں بھی کیں مگر کوئی بھی ملازمت وہ مستقل طور پر نہ اپنا سکا۔ دراصل ملازمت کے بندھن اور پابندیاں اس کے لئے ناقابل قبول تھیں۔

"...... دوستوں اور خیر خواہوں نے کئی مرتبہ مختلف قسم کی نوکریوں کے بندوبست کیے، مگر اس معاملے میں وہ ہر ایک کو بچہ دے جاتا اور سب سے بڑھ کر اپنی بیوی اور بچوں کو بھی...... وہ اپنے آپ کو کسی میکانکی نظام کے

حوالے کرنے کو تیار نہ تھا۔(22)

بہر حال ناصر نے کچھ دیر تک محکمہ دیہات سدھار میں کام کیا۔ پھر سوشل ویلفیئر کے محکمے میں نوکری کر لی کم وبیش پونے پانچ سال تک "ہمایوں" کی ادارت کی۔ "اوراقِ نو" بھی نکالا اور پھر "خیال" اور "ہم لوگ" بھی...... لیکن کوئی کام بھی مستقل نہ کیا۔ آخر 1964ء میں ریڈیو پاکستان لاہور میں بطور سٹاف آرٹسٹ کے ملازمت کر لی اور آخر تک یہیں کام کرتے رہے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران انہوں نے "سفینۂ غزل" اور کچھ اور عنوانات سے اردو کے اہم شعراء پر پروگرام لکھے اور خود ہی اپنی خوبصورت گہری آواز میں انہیں نشر کیا۔

ناصر کاظمی (جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے) فطرتاً آزادی پسند تھا۔ اسے پابندیوں سے سخت نفرت تھی، مگر ضرورتوں نے اسے ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا اور ایک ضرورت اس کی شادی کی صورت میں پیدا ہوئی۔

"جس نے تباہ رہنا منظور کیا تھا، اسے ملازمت کرنا پڑی،
اب ناصر کے لئے دو سطحوں پر جینا لازم آیا"۔(23)

ناصر کاظمی کی شادی 7 جولائی 1952ء کو ہوئی۔ ناصر رت جگوں کا خوگر اور رات کو دیر سے گھر آنے کا عادی تھا۔ گھریلو حالات میں بھی اس کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں کوئی بھی بیوی نہ خود سکون حاصل کر سکتی ہے اور نہ خاوند کے لئے وجہ سکون بن سکتی ہے۔ لیکن شفیقہ بیگم نے آتے ہی اس حقیقت کا ادراک کر لیا کہ اس کا شوہر ایک شاعر ہے جس کی کچھ عادتیں اور معمولات ہیں جن میں تبدیلی بہت دشوار ہے۔ اس لئے اس نے اپنے شوہر کی تمام عادات سے سمجھوتہ کر لیا اور اس کی سچی رفیق اور غمگسار ثابت ہوئیں۔

"...... جو کہ اپنے والدین کے ہاں ناز و نعمت سے پلی تھی'
تنگی بھی سہتی اور ناصر صاحب کی گھر سے بے نیازی بھی۔
ہر ایک سے ہنس کر ملی اور خاطر تواضع کی۔ وہ ناصر کی
طبیعت کو سمجھ گئی'اس کی بے نیازی کو اپنا لیا"۔ (24)

ناصر کے صاحبزادے باصر سلطان کاظمی نے بتایا کہ انکی والدہ شادی کے وقت ایف اے پاس تھیں۔ بعد میں انہوں نے پرائیویٹ طور پر بی اے کیا۔ پھر بی ایڈ اور اس کے بعد ملازمت بھی کر لی...... ناصر کے حالات سے سمجھوتے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے...... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر......

"بے روزگاری کے زمانے میں ناصر کاظمی کی بیوی نے
جس ایثار' حوصلے' استقامت اور وفا کا ثبوت دیا وہ اس دنیا
میں شاید دو چار شوہروں کو ہی نصیب ہو گا اور اگر میں یہ
کہوں کہ آوارگی اور شاعری کی فرصت جو اس دنیا میں ناصر
کاظمی کو ملی' وہ اس شریکِ حیات کے دم سے تھی کہ
جو ان دنوں چولہے پر ہنڈیا میں خالی پانی رکھ کے رشتہ
داروں کو یہ تاثر دیتی تھی کہ اس کے گھر میں بھی آگ
جلتی ہے اور کھانا بھی پکتا ہے...... دنیا جانے کیا کیا کہتی رہی
مگر ناصر کی بیوی ایک مرتبہ بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ
لائی' بلکہ یہ کوشش کی کہ ناصر کو غمِ روزگار کی ہوا تک نہ
لگے...... اس نے ناصر کو گھر میں ایسا ماحول عطا کر دیا تھا
کہ اسے فکرِ شعر کے علاوہ اور کوئی فکر نہ رہے"۔ (25)

باصر نے بتایا کہ وہ اکثر تمام گھر والوں کے ساتھ مری جایا کرتے تھے...... کبھی اکیلے مری نہیں گئے۔ خوش خوراک اور خوش پوش تھے اور اناس کا رس بڑے شوق سے پیتے تھے۔

خوش خوراکی' خوش پوشی اور اناس کا رس پینے کا شوق ناصر کو ہمیشہ رہا۔ کمزور مالی حالات کے دنوں میں بھی وہ کسی نہ کسی طرح اپنے اس شوق کی آسودگی کے سامان پیدا کر لیا کرتا تھا۔ ریستوران میں وہ ہمیشہ قیمتی ڈنر کا آرڈر دیتا۔ وہ بظاہر ایک غریب آدمی تھا مگر اس کا مزاج شاہانہ تھا۔ (منیر احمد شیخ۔ چراغوں کا دھواں)

مزاج کا یہ شاہانہ پن صرف اس کے کھانے پینے تک ہی محدود نہ تھا، معاشرے میں ادیب اور شاعر کا مقام وحیثیت بھی وہ شاہانہ دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ جب یہ آرزو پوری نہ ہو سکتی تو وہ اداسی' غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ لوگوں کو اس کے مقام اور حیثیت کو پہچاننا چاہیے' اس لئے کہ وہ اپنے خون سے معاشرے کی آبیاری کرتا ہے۔ ظاہر ہے' ہمارے اور ناصر کے معاشرے میں ادیب اور شاعر کی وہ حیثیت تو نہ تھی اور نہ اب ہے' جو ناصر کی خواہش تھی، یوں اس کی ہمہ گیر اور طویل اداسیوں کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ کئی اور معاملات کی طرح ناصر کاظمی نے اس حوالے سے بھی اپنے گرد وپیش Fantasy کا ایک ہالہ سائن لیا تھا' جس سے وہ نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آج کے اس مادی دور میں بھی شاعری کو ایک کُل وقتی پیشہ (Full-time job) کے طور پر دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ اس کے خیال میں شاعر کو صرف شاعر ہونا چاہیے۔ ناصر کے اپنے الفاظ میں۔

"آپ بتائیے' کبھی میر نے کوئی اور کام کیا شاعری کے

علاوہ' یا غالب نے کوئی اور کام کیا' علامہ اقبال نے کوئی اور
کام کیا' D.H.Lawrence نے کبھی کوئی کام کیا'
Lorca نے کبھی کوئی اور کام کیا' کالی داس نے سوائے
اس کے کہ بھجن گاتا!...... بلھے شاہ نے کچھ کیا' سلطان باہو
نے کبھی کچھ کیا' وارث شاہ نے کبھی کچھ کیا"۔ (26)

ناصر کاظمی کی زندگی میں اس کے کچھ اور مشاغل کو بھی بے حد اہمیت ہے۔ مثلاً کبوتر بازی کا شوق ناصر کو بچپن سے آخر تک رہا۔ کبوتر ان کے لئے زمین و آسمان کے درمیان انسان کے باہمی رشتے کی علامت ہے۔ ان کے اپنے خیال میں کبوتر کی معنویت بہت زیادہ ہے۔ کبوتر بازی کے شوق کی نفسیاتی وجہ ان کے صاحبزادے باصر سلطان کاظمی نے یہ بتائی کہ ناصر کاظمی ایئر فورس میں جانے کے ہمیشہ خواہش مند رہے' مگر نہ جا سکے۔ یہ شوق آرزو کی اسی ناآسودگی کا نتیجہ ہے۔ ناصر کے ایک دوست منیر احمد شیخ (بہ حوالہ : چراغوں کا دھواں) نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو' اس لئے کہ ہوا باز کی اپنے جہاز کے ذریعے کھلی فضاؤں میں قلابازیاں ہوں یا کبوتر کی قلابازیاں ہوں' ناصر کو دونوں میں مماثلت نظر آتی ہے' دونوں بلند پروازوں کی خبر لاتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ خود کہتے ہیں۔

"کبوتر تمام پرندوں میں سب سے زیادہ نجل اور خوش شکل
پرندہ ہے اور پرندے جو خدا نے پیدا کئے ہیں اور ان کا جو
رشتہ انسانوں سے باندھا ہے تو اسکے کچھ معنی بنتے ہیں' پرندہ
اڑتا ہے' ہواؤں میں' بلندیوں میں کہ یہ پرواز انسانی آرزوئیں
کی علامت اور اس کا استعارہ ہے۔ انسان اُس کے ساتھ اپنے

آپ کو اڑتا ہوا اور بلند محسوس کرتا ہے"۔(27)

ناصر کاظمی کو کبوتر بازی کا اس قدر شوق تھا کہ ان کی نسلوں' انواع واقسام' بیماریوں اور ان کے علاج کے بارے میں بھی ان کو وسیع معلومات حاصل تھیں۔ اس کا اندازہ اس مضمون سے ہوتا ہے جو انہوں نے "آفاق" میں لکھا۔(28)

ناصر کاظمی کی شاعری میں ہمیں موسیقی کا اثر ملتا ہے وہ محض روایتاً نہیں کہ اس نے چھوٹی بحر یا لمبی بحر کے ذریعے سے یا لفظوں کی تکرار سے یا کسی اور ذریعے سے موسیقی پیدا کر دی ہو' بلکہ وہ کسی حد تک موسیقی کے اسرار و رموز سے آشنا بھی تھا۔

"موسیقی کے پیچھے اس نے اپنی ساری جائیداد تو نہیں ہاں
بقول خود دو سال ضرور ضائع کئے ہیں۔ ان دو سالوں میں
بر عظیم کے سب سے بڑے موسیقار نے اسے سارنگی پر
صرف انگلیاں رکھنی سکھائیں"۔(29)

ذیل کے جملوں سے بھی ناصر کے اس ذوق اور پسندیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو اس کو موسیقی کے حوالے سے تھی۔

"......اس راگنی نے ایک بار پھر میری روح کی جوت جگا دی
'گائیک گا رہا تھا اس کی تان کے ساتھ ساز بولتے' جب وہ
کوئی لمبی اور گہری تان لگاتا تو سارنگی ساتھ ساتھ بولتی......
میرے کمرے کی ہر چیز سنگیت سے بھر گئی"۔(30)

ناصر کاظمی کی شاعری میں رات ایک اہم استعارے کے طور پر سامنے آتی ہے' شاعری ہی نہیں اس کی شخصیت بھی رات کے طلسم کی اسیر ہے۔ رات بظاہر تاریکی کا ایک پردہ ہے۔ مگر ناصر کے لئے اس کی معنویت کچھ اور ہے۔

"رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ
رات اندھیری رات نہیں یاوہ جسے ہمارے، جدید شاعر تاریکی
کا استعارہ کہتے ہیں...... رات تخلیق کی علامت ہے، دنیا کی ہر
چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے، پھلوں میں رس پڑتا ہے رات
کو، سمندروں میں تموّج ہوتا ہے رات کو، خوشبوئیں جنم لیتی
ہیں، حتیٰ کہ فجر تک، فرشتے رات کو اترتے ہیں۔ سب سے
بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوئی"۔ (31)

دراصل اداسی اور تنہائی ناصر کی شخصیت کا ایک اہم حصہ تھی۔ اسے کچھ کھوئی ہوئی چیزوں کی تلاش تھی اور تلاش کا یہ سودا صحیح معنوں میں رات کو ہی جاگتا تھا۔ ناصر کی رات کا سفر، اسرار سے بھرا ہوا ایک منظر نامہ ہے، جس میں اداسی ہے، رت جگا ہے، تنہائی اور خاموشی ہے اور ساتھ تلاش کا ایک طویل اور نا تمام سفر۔

"رات جتنی بھیگتی جاتی، اس کی آنکھوں میں چمک اور
اس کی آواز میں گرمی پیدا ہوتی جاتی۔ اس کا تخیل بھک کر
کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ میر کے شعر پڑھتے پڑھتے اسے
سورداس کا کوئی دوہا یاد آجاتا، کبھی کبیر (ناصر کو میرا بائی
کے بھجن بھی تو بے حد پسند تھے، اس کے نزدیک میرا بائی
اداسی کی بہن ہے) مگر جب تڑکا ہونے لگتا تو ناصر چپ ہو
جاتا۔ چپ اور اداس، اور اسے نیند آنے لگتی"۔ (32)

ناصر کی اداسی کے اسباب کچھ بھی ہوں، اسے محبت کی ناکامیوں نے اداس کر دیا ہو، قدروں کے زوال نے آزردہ کر دیا ہو، اسے زندگی سے فرصتوں کے چھن جانے کا دکھ

ہو یا نئے نظام (مادی زندگی) میں نہ ڈھل سکنے کا دکھ لاحق ہو...... بہر حال وہ اداس تھا۔

ناصر کی شخصیت کی اداسی اس کی شاعری کی دکھی آواز بن گئی ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ اس کی زندگی اور شاعری میں کم کم فاصلہ تھا۔ اس کے ہاں اداسی' شاعرانہ اندازِ زیست کا ایک استعارہ ہے۔ ناصر کے حوالے سے۔

"اداسی کے بغیر نہ زندگی اپنا جادو جگاتی ہے نہ محبت۔ اداسی کے معنی ہیں شاعر ہونا یا اس سے بڑھ کر انسان ہونا۔ یوں ناصر کی شاعری میں اداسی صرف ایک کیفیت بن کر نہیں آتی' بلکہ زندگی کی ایک قدر بن جاتی ہے"۔ (33)

ناصر کی شدتِ احساس نے اس میں زندگی کا مقابلہ کرنے کا جہاں حوصلہ پیدا کیا وہاں کم بھی کیا۔ مزاج کی رومانیت اپنی جگہ تھی' مگر تابہ کے...... ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا سفر کٹھن تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ زندگی جو ناصر کو ملی' اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھی' اس لئے اس کی اداسیاں' تنہائیاں اور تھکن بڑھتی گئی۔ جوں جوں اس کے رت جگوں کو زوال آتا گیا' وہ جسمانی زوال کی جانب چلتا گیا۔

"اس نے کسی سے بھی ذکر نہیں کیا' مگر چپکے سے اپنے پیٹ میں کینسر لئے پھرتا رہا۔ اس کے معالجوں کو بھی ایک عرصے تک پتا نہ چل سکا کہ وہ اپنے پیٹ میں کیا چھپائے بیٹھا ہے یا اگر انہیں علم ہو گیا تھا تو وہ بھی پردے ڈالتے رہے۔ ہم سب باری باری اس پر پردے ڈالتے رہے۔ کبھی اس کی عُسرت پر' کبھی اس کی آوارگیوں پر' کبھی اس کی لاابالیوں پر کبھی اس کی حسرتوں پر...... مگر وہ زمانے

سے کب تک لڑتا"۔ (34)

ناصر کاظمی کی بیماری کے آخری دن بڑے صبر آزما تھے۔ بیماری خطرناک تھی اور وسائل حد درجہ محدود...... اور ناصر ہر لمحہ موت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ادیبوں کے پرزور مطالبے پر حکومت نے کچھ رقم امداد کے طور پر دی...... بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں۔

"زمانے نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے چند لمحات اور گزارنے کی مہلت دے دی۔ حکومت نے اسے البرٹ وکٹر ہسپتال میں ایک صاف ستھرا کمرہ اپنے آخری ایام گزارنے کے لئے دے دیا اور ڈاکٹروں نے کوشش کی وہ چند یوم اور زندہ رہ جائے"۔ (35)

اور بالآخر 2 مارچ 1972ء کو وہ اجنبی مسافر اور اداس شاعر اپنی مسافرت اور اداسیوں سے آزاد ہو گیا۔ عمر بھر کی نیند کی تلاش اب مکمل ہو گئی۔

یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

ایک عجیب اتفاق ہے کہ ناصر کی شخصیت اور شاعری کا حقیقی سفر ایک آشوب سے شروع ہوا تھا اور اس کا انجام بھی ایک آشوب پر ہوا۔ اس سفر کا آغاز تقسیم ملک کے آس پاس ہوا اور انجام سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے کے قریب قریب رونما ہوا۔ اول آشوب آخر آشوب!

"ناصر کاظمی کا شعری سفر ایک بڑے تہذیبی آشوب کے دنوں سے ہوا تھا اور ایک دوسرے آشوب کے دنوں میں تمام ہوا، یوں تو ناصر کاظمی غزل پہلے بھی کہتا تھا لیکن اس کی غزل کی پہچان 1947ء کے فسادات کے بعد ہی ہوئی۔ اس

طرح اس کی آخری عمر کی غزلوں میں کئی رویے تلاش کیے
جا سکتے ہیں لیکن ناصر کے شعری سفر کا اختتام طوفانی راتوں
میں بچھونے والوں اور جلی ہوئی عمارتوں کے تذکرے پر
ہوا' جن کے پس منظر میں مشرقی پاکستان میں ہونے والی
المناک اور دہشت انگیز واردات موجود تھی"۔(36)

اور یہ اشعار اس کے آخری ایام میں اس کی ذہنی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے' کیا ہوئے
عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

اور......

جنت ماہی گیروں کی' ٹھنڈی رات جزیروں کی

ماہی گیروں کی جنت اور جزیروں کی ٹھنڈی رات کے اس نوحہ گر نے ایک بار کہا تھا۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

اور اس میں کیا شک ہے کہ دنیا تو اسی طرح دائم آباد ہے' جیسے ناصر کے عہد میں تھی، مگر اس میں ناصر موجود نہیں۔ یہی شعر ناصر کی قبر کے کتبے پر کندہ ہے۔

حوالہ جات

1- انتظار حسین، آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے، بہ حوالہ نقوش، مئی 1952ء، ص 171
2- احمد عقیل روبی، مجھے تو حیران کر گیا وہ، ص 86
3- شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی، ایک دھیان، ص 28-29
4- صغریٰ بی بی، "ہم، کبوتر اور شاعری" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 9
(نوٹ: ڈاکٹر حسن رضوی کی تحقیق کے مطابق صحیح تاریخ پیدائش یکم ستمبر 1923ء ہے
بہ حوالہ "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا شاعر")
5- ناصر کاظمی، آخری گفتگو، بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 192
6- ناصر کاظمی، غیر مطبوعہ ڈائری نمبر 1، بہ حوالہ ناہید ندیم، ناصر کاظمی، شخصیت اور فن
غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ، پنجاب یونیورسٹی (یہ مقالہ اب کتابی صورت میں چھپ چکا ہے)
7- ناصر کاظمی، آخری گفتگو، بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 195
8- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" سویرا، شمارہ 17`18، ص 220
9- ناصر کاظمی، غیر مطبوعہ ڈائری نمبر 1، بہ حوالہ ناہید ندیم، ناصر کاظمی شخصیت اور فن،
غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور (یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے)
10- صغریٰ بی بی، "ہم، کبوتر اور شاعری" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 11
11- ناصر کاظمی، غیر مطبوعہ ڈائری نمبر 1، بہ حوالہ ناہید ندیم، ناصر کاظمی شخصیت اور فن،
غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور (یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے)
12- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" سویرا، شمارہ 17-18، ص 219
13- عبدالمجید، "وہ ایک نہال تھا جو اگا اور جل گیا" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 19
14- منیر احمد شیخ، "چراغوں کا دھواں" احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 65
15- بہ حوالہ، "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر" (ڈاکٹر حسن رضوی، ص 15)

16- یہ ملاقات 26 دسمبر 1978ء کو 8 حکیم روڈ اسلام پورہ لاہور میں ہوئی
17- انتظار حسین، "چار گھڑی یاروں کا میلہ" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 34
18- ناصر کاظمی، آخری گفتگو، بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 193
19- صغریٰ بی بی، "ہم، کبوتر اور شاعری" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 13
20- ناصر کاظمی، آخری گفتگو، بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 93-194
21- ڈاکٹر عبادت بریلوی، "ناصر کاظمی اور برگِ نے" جدید شاعری، ص 500
22- منیر احمد شیخ، "چراغوں کا دھواں" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 77
23- انتظار حسین، "ناصر کاظمی کی یاد میں، شادی اور موت" فنون، شمارہ اگست، ستمبر 1972ء ص 57
24- صغریٰ بی بی، "ہم، کبوتر اور شاعری" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 14
25- منیر احمد شیخ، "چراغوں کا دھواں" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 77
26- ناصر کاظمی، آخری گفتگو، بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 215
27- ارشاد صدیقی، "ناصر کاظمی کے کبوتر" ماہ نو، جون 1977ء، ص 66
28- "ناصر کاظمی "کبوتروں کے بارے میں" روزنامہ آفاق، 7 فروری 1955ء
29- انتظار حسین، "آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے" نقوش، مئی 1952ء، ص 167
30- ناصر کاظمی، "سارنگی کو سورنگی بنانے والا فنکار" روزنامہ آفاق، 17 جنوری 1955ء
31- ناصر کاظمی، آخری گفتگو، بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 203-204
32- انتظار حسین، "ناصر کاظمی، نیند کی تلاش میں" راوی، اپریل 1972ء، ص 24
33- سلیم احمد، "نئی دنیا کا مسافر" احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 95-96
34- منیر احمد شیخ، "چراغوں کا دھواں" بہ حوالہ احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 80
35- ڈاکٹر مقصود احمد زاہدی، یادوں کے سائے، ص 188
36- ڈاکٹر سہیل احمد خان، "اداسی کی تہذیب" طرزیں، ص 78

باب دوم

جدید اُردو غزل، غالب سے ناصر کاظمی تک

اردو شعر وادب میں قدیم وجدید اور روایت وجدیدیت کے مباحث بڑے پرانے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہی ادب پارہ شاہکار کا درجہ پاتا ہے اور تادیر زندہ رہتا ہے جس میں روحِ عصر جھلکتی ہو' کوئی نئی بات موجود ہو' یا روایتی اسالیب اور روایتی موضوعات میں تنوّع کا اہتمام ہو' تاہم ادب میں روایت کی اہمیت بھی مسلمہ رہی ہے' اس لئے کہ آج کی جدت یا جدیدیت بھی آنے والے کل کے اظہار واسلوب کے تناظر میں محض روایت بن سکتی ہے۔ یہ نشوونما اور ارتقاء کا ایک فطری عمل ہے جس سے نہ انسان کا فرار ممکن ہے اور نہ انسان کے اظہار وبیان اس کے اثرات سے آزاد ہو سکتے ہیں۔

شعر وادب کے اس سفر میں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کی قدیم روایت میں بھی نئے طرزِ احساس اور جدید اسلوبِ بیان کے اثرات مل جاتے ہیں۔ مثلاً غالب جو جدید غزل کا اولین بامعنی حوالہ ہے، اس سے پہلے مصحفی کے ہاں بھی کہیں کہیں اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں جو جدید طرزِ احساس سے عبارت ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے:

سوئے نجد جی کا یہ قافلہ عجب اس کا کیا جو چلا نہیں
کہ ہوائے شدتِ برف ہے ابھی قافلے کی ہوا نہیں

تاہم اردو غزل کو جس شاعر نے صحیح معنوں میں جدید طرزِ احساس اور نئے

اسلوبِ بیان سے آشنا کیا وہ غالب تھا۔ غالب کا یہ نیا انداز روایت سے صحت مند انحراف کی بنیاد پر تھا اور یہ انحراف اس قدر موثر اور دُور رس ثابت ہوا کہ اس نے نہ صرف اپنے عصری شعر وادب کو متاثر کیا بلکہ آنے والے شعری وادبی زمانوں پر بھی اپنے اثرات مرتسم کئے۔ یہی سبب ہے کہ غالب کی شاعری آج بھی بے جواز محسوس نہیں ہوتی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کی چھٹی حس کچھ زیادہ ہی بیدار تھی کہ اس نے اس انقلاب کی چاپ انیسویں صدی کے وسط میں ہی سن لی تھی جو مغربی سیاست وتمدن کے ذریعے اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ آنے والا تھا اور جس کے سبب ادب اور تہذیب کی موجود اساس بھی بدل جانے والی تھی، اس کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ غالب اپنے عہد کے شعری مزاج اور سماجی گرد وپیش سے مطمئن نہیں تھا۔ احمد ہمدانی کے مطابق :

"اس نے بہت سے مسلّمات کو شک کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے ذاتی فکر واحساس کے جِلَو میں زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی"۔(1)

مسلّمات کو شک کی نگاہ سے وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو زندگی میں کسی طرحِ نو کا متلاشی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے روشِ عام سے انحراف کر کے اپنی مخصوص انفرادیت اور اس کے اظہار وبیان کا ایک نیا اسلوب اختیار کیا اور یہ بھی روشِ عام سے انحراف کا ہی نتیجہ نظر آتا ہے کہ غالب کو غزل کی تنگ دامنی کی شکایت تھی' ورنہ روایتی موضوعات اور ان کے روایتی اظہار کے پیمانے تو موجود تھے جن کو غالب بھی برت سکتا تھا' مگر اس نے ایسا نہ کیا اور روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ مروجہ اسلوبِ اظہار سے انحراف کا راستہ اختیار کیا۔

"(غالب کے) اس رجحان نے غزل کے میدان کو بہت وسیع کیا اور موضوعاتِ عشق کے ساتھ حیات وکائنات کے مسائل کو سمونے کا رجحان اردو غزل میں عام ہونا شروع ہوا۔ یہ اردو غزل میں بہت بڑی جدّت تھی"۔ (2)

چنانچہ اسی جدّت کی وجہ سے غزل کے عمومی موضوعات، مثلاً حُسن و عشق اور اس کے دیگر تلازمات غالب کے ہاں احساس واظہار کے ایک نئے قالب میں نظر آتے ہیں۔ اس نے جہاں موضوعات کو وسعت بخشی، وہاں الفاظ کے مخصوص استعمال سے ان کے معانی میں بھی اضافہ کیا۔ اسی کی بدولت غزل کی زبان میں ایسے مرکبات اور محاورات شامل ہوئے جو نُوع بہ نُوع اور تیز تر عصری تغیرات کے باوجود آج بھی زندہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے انسانی نفسیات کو اپنے شعری سانچوں میں ڈھال کر غزل کا معنوی دائرہ مزید کشادہ کر دیا۔

ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ غالب کا یہ کمال بھی ہے کہ اس نے غزل کے اس روایتی لہجے میں تبدیلی پیدا کر دی جس کی بنیاد ایک خاص طرح کی مسکینی، دل گیری، درویشی اور سادہ پن پر تھی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں اردو غزل پہلی بار ایک مردانہ آواز سے آشنا ہوئی۔ لہجے میں اس انقلابی تبدیلی میں بھی دراصل روایتی سانچوں سے صحت مند انحراف کا پہلو کارفرما تھا۔

احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی اور گیرائی اور سوچ کی پختگی کی اصطلاحیں اردو غزل کے اور کئی شعراء کے لئے بھی استعمال کی جا سکتی ہیں، تاہم ان حوالوں سے غالب کی انفرادی اور اجتہادی آواز اس سارے ہجوم میں صاف پہچانی جاتی ہے۔ اس آواز میں فکر وخیال کا اثر بھی شامل ہے اور لب ولہجے کا نیا پن بھی، نئے

افکار وخیالات کی لہریں بھی موجزن ہیں اور نئے احساس وشعور اور نئے تجربوں اور مشاہدوں کی حدت وشدت بھی...... اور یہی وہ سرمایہ ہے کہ جس سے اردو غزل پہلی بار مالا مال ہوئی تھی۔ اس کے دائرۂ کار میں اس قدر وسعت آگئی کہ حیات وکائنات کے سارے گوشے' دریچے اور پھیلاؤ اس کی دسترس میں آگئے۔ عابد علی عابد کے خیال میں یہ وسعت غالب کی شخصیت ہی کا عکس ہے جس میں تنوّع اور وسعت ہے:

> "غالب کی شخصیت کی طرح اس کے کلام میں بڑی وسعت ہے۔ اس کی چشمِ بینا نے حیات وکائنات کو ہر ممکن نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس کی اس طرح ترجمانی کی کہ اس میں سب کچھ دیکھا۔ مجاز اور حقیقت بھی، شرحِ دردِ اشتیاق بھی اور حُسنِ کرشمہ ساز کی معجز نمائیاں بھی"۔(3)

غالب کے یہ اشعار اس کے مخصوص رنگ وآہنگ کی عکاسی کرتے ہیں۔

در خورِ قہر وغضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

حسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولئی انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

گنتی کے یہ اشعار غالب کی شعری عظمت کا ہرگز احاطہ نہیں کر سکتے، تاہم اس حقیقت کی جانب اشارہ ضرور کرتے ہیں کہ یہ انداز اور اسلوب غیر روایتی ہے اور احساس بھی مروجہ سانچوں سے مختلف اور منفرد ہے، جو ان اشعار کے خالق کو ایک بڑا شاعر بناتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جدید بھی۔

اردو غزل میں کچھ نئے رنگ حالیؔ کے وسیلے سے بھی شامل ہوئے تاہم یہ نئے رنگ غالب کے نئے اور جدید رنگ سے ذرا مختلف نوعیت کے تھے۔ حالی نے یوں تو مسدس، مثنوی اور نظم پر بھی طبع آزمائی کی مگر ساتھ ساتھ غزل کو بھی آگے بڑھایا۔ حالی کی غزل پر بات کرتے ہوئے ان کے "مقدمۂ شعر و شاعری" کا حوالہ ناگزیر محسوس ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ غزل کو حُسن و عشق کے مروجہ لوازمات اور عمومی موضوعات تک

محدود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا۔ وہ زندگی کے کسی بھی پہلو اور گوشے کو غزل کی دسترس سے باہر خیال نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں عشقیہ مضامین میں بھی ایک مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔ جس میں دوستی، مروت اور روحانی و جسمانی قسم کے سارے امکانی رشتوں کی شبیہیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے ہاں مناظرِ فطرت، حب الوطنی، قومی ہمدردی، عظمتِ رفتہ، معاشرے کی ہمہ گیر اصلاح اور سیاست و سماج کے موضوعات بھی ملتے ہیں، جس سے اردو غزل کو نئی جولاں گاہیں میسر آئیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس رجحان کو اپنی نوع کی ایک انقلابی تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں :

"انہوں نے غزل کو ایک ایسے انقلابی رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا جس سے غزل اس سے پہلے ناآشنا تھی"۔ (4)

خود حالی نے جب یہ کہا کہ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دُکاں سب سے الگ

تو اس سے حالی کے اس رجحان کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ یہ رجحان دراصل اس مقصدیت سے عبارت نظر آتا ہے جو سرسید تحریک کے زیرِ اثر حالی کے ہاں در آیا تھا اور جس کے نتیجے میں حالی کی غزل میں سیاسی، اخلاقی، تعلیمی، مذہبی، غرض ہر قسم کے مضامین شامل ہوئے۔ حالی کے اس تجربے کے زیرِ اثر ان کی غزل میں تغزل کی کمی ضرور واقع ہوئی مگر ایک خاص طرح کی دردمندی نے جنم لیا جو ان کو ہمارے ان قومی رہنماؤں کی صف میں لے گئی جو اس عہد کے مخصوص تناظر میں ملی بیداری پیدا کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

محبت اور غمِ محبت کا ذکر حالی نے بھی کیا ہے مگر انہوں نے اس جذبے کو محض محبوب کی ذات کا اسیر بنانے کی بجائے معاشرے کے تمام امکانی رشتوں پر پھیلا دیا ہے۔ ان کے ہاں بیانِ عشق ذاتی کم اور اجتماعی نوعیت کا زیادہ ہے۔ حالؔی کے خیال میں عشق و عاشقی کے ترانے آج کی زندگی کو زیبا نہیں بلکہ عیش و عشرت کی رات اب بیت چکی۔ اب کانگڑے اور پھاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگیا الاپ کا وقت ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں :

"ایشیائی شاعری جو عشق و عاشقی کی جاگیر ہو گئی ہے، اس
کو جہاں تک ہو سکے، وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد
حقائق و واقعات پر رکھی جائے"۔ (5)

حقائق و واقعات کا وہ شعور جس کی جانب یہاں حالؔی نے اشارہ کیا ہے' اس کا ایک انداز خود ان کے ہاں "مکھیوں میں اتحاد" اور "چیونٹیوں میں اتفاق" کی صورت میں ملتا ہے۔ اس انداز کو غزل میں ایک نئی معنویت کے اضافے کا نام تو شاید دیا جا سکتا ہے تاہم اس میں تغزل کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ غزل میں یہ نئی معنویت حالی کے اپنے انداز کی جدیدیت بھی قرار دی جا سکتی ہے' جسے سلیم احمد جدیدیت تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے تو وہ کہتے ہیں :

"حالؔی کو جدیدیت سے زیادہ اپنا مظفر عزیز ہے"۔ (6)

تاہم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ حالؔی نے غزل کی روایت میں نئے مضامین شامل کئے اور حقیقی اور سامنے کی زندگی کے مسائل کو غزل میں سمو کر نئی زندگی کے نئے امکانات کو اس طرز سخن میں شامل کرنے کا راستہ پیدا کیا۔ یہ ضرور ہے کہ حالی لب و لہجے کی وہ توانائی اختیار نہ کر سکے جو غالب کے وسیلے سے اردو غزل میں داخل ہوئی تھی۔ ان کے لہجے کی نرمی، اداسی بلکہ ایک طرح کی مسکینی جو آنسو بھری سی ہے..... ان کے مزاج کی آئینہ دار

ہے۔ عظمت رفتہ کی یاد اور حسن ماضی کا خیال حالی کے لئے ہمیشہ حرزِ جاں بنا رہا جس نے کہیں کہیں مرثیہ گوئی کا سا رنگ پیدا کر دیا۔ چنانچہ فراق گورکھپوری کے بقول :

"ہم حالی کو ہندوستان کی اداسی کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ حالی کی غزلوں میں اداسی کی فضا انفرادی یا عشقیہ ناکامی کے ماتم کی فضا نہیں بلکہ ہندوستان کی اداسی کی فضا ہے"۔ (7)

یہ اشعار حالی کی اسی اداسی کے عکاس ہیں :

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گُل کی قفس میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

حالی کی غزل کا ایک پہلو یہ بھی ہے :

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی، ان کی نشانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

اور ایک رنگ یہ بھی ہے :

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

امیر مینائی اور داغ دہلوی اپنے اپنے رنگ کے غزل گو ہیں۔ دونوں ہم طرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے' دونوں کے شاگردوں کا سلسلہ طویل اور دونوں کا حلقۂ احباب وسیع تھا مگر اتفاق کی بات ہے کہ شہرت زیادہ داغ کو نصیب ہوئی۔ داغ کی غزل مقبولِ عام ہے اور شاعری یا شعر فہمی کا عمومی سا ذوق رکھنے والا بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے' تاہم کچھ صاحبِ ذوق داغ کے سطحی اشعار کو پسند نہیں کرتے بلکہ انہیں امیر کی غزل کی متانت و تہذیب اور بلند خیالی زیادہ مرغوب ہے۔

امیر کا ابتدائی کلام ناسخ کے رنگ میں ہے جس کی تشکیل رکیک و مبتذل خیالات، بے مزہ تشبیہوں' انگیا کُرتی اور کنگھی چوٹی جیسی رعایتِ لفظی سے ہوئی ہے' البتہ بعد میں رفتہ رفتہ یہ رنگ بتدریج ختم ہو گیا اور اس میں صفائی اور روانی کے ساتھ معنوی سطح پر بھی بلندی آ گئی۔ اس کے مقابلے میں داغ کا طرزِ خاص کچھ کچھ امیر مینائی سے بہتر دکھائی دیتا ہے۔ جرأت کی معاملہ بندی، آتش کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ مل کر داغ کے ہاں جمع ہو گئی اور یہی اس کا طرزِ خاص ہے۔ روز مرہ اور زبان، محاورات کا بر محل استعمال، لفظوں کا دروبست اور خیالات کی دل نشینی ہے' جس نے داغ کے اشعار کی خارجی سطح کو نکھارا ہے' تاہم داغ اور امیر مینائی کی غزل کے مجموعی مزاج کا جائزہ لیں اور اردو غزل کے اس بدلتے ہوئے شعور کے ساتھ اس کا مقام متعین کریں جس کا آغاز غالب اور حالی نے اپنے اپنے انداز میں کیا تھا...... تو ہمیں مایوسی ہو گی' اس لئے کہ ان کی غزل کسی نئے موسم کی نوید دینے کی بجائے اسی روایت کی بازگشت محسوس ہوتی ہے جو قدیم اور حالی کے نقطۂ نظر سے فرسودہ ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ داغ اور امیر نے روایت کی از سرِ نو تجدید کی۔...... داغ کا حوالہ ایک اور ضمن میں بھی دیا جاتا ہے کہ اردو کے ایک انتہائی اہم شاعر اقبال کی ابتدائی شعری تربیت میں اس کا نام آتا ہے جس

کے زیرِ اثر اقبال نے اس قسم کے اشعار کہے :

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اور

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

مگر اقبال اس راستے پر زیادہ دیر تک نہ چل سکے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال، داغ کی طبیعت اور ان کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے تھے :

"جن حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑا اور جو حالات خود انہوں نے پیدا کئے وہ داغ کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اقبال کو ابتداء میں روایتی ماحول ملا اور وہ ایک حد تک اس کے زیرِ اثر بھی آگئے لیکن یہ اثر ان پر زیادہ عرصے باقی نہیں رہا"۔ (8)

اقبال کی غزل سرائی دراصل راکھ کے ڈھیر سے آتشِ رفتہ کی چنگاری کی جستجو اور اسے شعلۂ جوالہ میں تبدیل کرنے کا عمل ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے اس رجحان کا

تجزیہ کرتے ہوئے اسے غالب کے نظامِ خیال کے ساتھ مربوط کیا ہے کہ اول اول غالب نے روایتی اردو غزل سے انحراف کیا اور پھر اقبال نے انحراف کو ایک نوع کی انقلابی تبدیلی کی شکل دی۔

> "پرانی غزل کے نظامِ اقدار پر غالب کے ہاں جو تشکیک نمودار ہوئی تھی وہ اقبال کے ہاں یقین میں بدل جاتی ہے اور اقبال غزل کے خاکستر سے ایک نیا جہان غزل تیار کرتے ہیں"۔(9)

اس نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال کی غزل گوئی کا زمانہ وہ بنتا ہے جب خدا کی زمین ارضی خداؤں سے بیزار اور سیاست کے قدیم معیارات سے نالاں نظر آ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسکے ہاں نئی غزل نے جس نظامِ اقدار میں تربیت پائی' اس میں معشوق (حاکم وقت) کی بجائے عاشق (عام آدمی) کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔

اقبال سے پہلے غزل میں ایک ایسے تصوف کا ذائقہ ملتا ہے جس کا نتیجہ فنا ہے مگر اقبال کے خیال میں وہ معاشرے کے اجتماعی وجود کے لئے مہلک ہے' اس لئے اقبال نے اگر اپنی غزل میں تصوف کے کسی تصور کو جگہ دی ہے تو اس کی ابتداء اور انتہا دونوں کا محور بقا ہے۔ اس میں عاشق اپنی ہستی کو معشوق کے وجود میں گم کر کے نفیٔ ذات کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ استحکامِ ذات اور اثباتِ خودی کے لئے خود شناسی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اسی ن کا منطقی نتیجہ ہے کہ اقبال کی غزل کا لہجہ بھی اردو غزل کے روایتی مسکین اور محکوم لہجے کی بجائے رعب و جلال اور بلند آہنگی سے بھرپور محسوس ہوتا ہے اور اس امر میں شبہے کی گنجائش کم ہے کہ غالب کے بعد اقبال ہی ہے جس نے واضح طور پر غزل کے

روایتی لہجے سے انحراف کیا اور جس کے سبب غزل کی روایتی ماتمی لَے امید ورجا کی آواز میں ڈھل جاتی ہے جو بلاشبہ جدیدیت کی ہی ایک صورت ہے۔ بلکہ نظیر صدیقی نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ :

> "اردو غزل میں جدیدیت کے پہلے عظیم علمبردار غالب ہیں اور آخری عظیم علمبردار اقبال...... دونوں کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ دونوں نے غزل کی روایات سے منحرف ہو کر غزل کو جن نئے عناصر سے روشناس کیا، ان کو جمالیاتی تکمیل کے اس درجے تک پہنچا دیا کہ وہ نئے عناصر قارئین کیلئے نہ صرف قابلِ قبول بن گئے بلکہ حد درجہ جاذبِ توجہ بھی"۔**(10)**

اقبال نے تصوف و فلسفہ اور سیاست و معیشت کے خشک ترین مسائل کو جذبات کی ایک نئی جدت کے ساتھ اپنی غزل میں اس طرح پیش کیا ہے کہ حالی کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی دیتا ہے جس میں انہوں نے غزل کو "ہر قسم کے جذبات کا آرگن" بنانے کی بات کی تھی اور جس میں وہ خود پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اس حوالے سے اقبال کی کامیابی کا راز یہی نظر آتا ہے کہ اس نے مقصدیت کے اظہار میں بھی شعریت اور تغزل کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حالی اور اقبال کی اس معنوی اور فکری مماثلت کے تناظر میں ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں :

> "اردو غزل کی مخصوص روایات سے فکری رشتہ منقطع کر لینے کے بنا پر اقبال کی غزل کا صرف حالی کی غزل کے تناظر میں مطالعہ سود مند ہو سکتا ہے۔ حالی نے غزل سے

قومی مرثیہ خوانی کا کام کیا تو اقبال نے قومی بیداری کا۔
یوں کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے غزل کو جہاں سے چھوڑا،
اقبال نے وہیں سے غزل کو شروع ہی نہ کیا بلکہ اسی انداز
کا خاتم بھی ثابت ہوا"۔ **(11)**

اقبال کے ہاں احساس و اظہار کے قرینے میں تبدیلی اور لہجے میں انقلابی تغیر...... یقیناً نئی زندگی کی ضرورت تھی جسے اس نے پورا کر دیا اور یوں اس نے اردو غزل کے ارتقائی سفر کو نئی منزلوں اور نئے راستوں سے آشنا کیا۔ مگر اس انداز میں کہ روایت اور جدت و جدیدیت ساتھ ساتھ چلتی ہے گویا وہ آتش رفتہ کے سراغ میں ہے مگر ساتھ ہی آتش نو کا نقیب بھی ہے۔

میرے نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت، وہ نگہ کا تازیانہ
تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے، نہ شکایت زمانہ

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
میں کہاں ہوں، تو کہاں ہے، یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

واضح طور پر دو مختلف منطقوں کے موسموں کے رنگ دیکھنے کے لئے شاد عظیم آبادی کی غزل ہے۔ مراد یہ ہے کہ ابتداء میں ان کے ہاں طربیہ رنگ جھلکتا ہے مگر بعد یہ رنگ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے رفتہ رفتہ غائب ہو گیا اور رس بھری، بے پیے متوالی، آنکھوں کے ترانے درد و کرب میں ڈوب گئے۔ اس درد و کرب نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی تاہم اس میں آرزو مندی کا ذائقہ بہر حال موجود رہا۔ اداسی کی کیفیت شاد کی غزل میں جا بجا جھلکتی ہے لیکن میر کے انداز سے فطری رغبت کے باوجود یہ اُداسی میر کی ہمہ گیر اداسی سے مختلف محسوس ہوتی ہے۔ روایتی انداز بیان کی وجہ سے شاد کی غزل روایت میں کسی نئے راستے کا اشارہ نہ بن سکی تاہم ان روایتی طرز سخن میں بھی ایک لطف محسوس ہوتا ہے جس میں لمبی بحروں کے استعمال سے موسیقیت کا عنصر پیدا ہو گیا ہے۔

دل اپنی طلب میں صادق تھا، گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا، دریا میں یہ جا کر ڈوب گیا
پیری میں جوانی کی باتیں، کیا عرض کروں، اک قصہ ہے
وہ طرز گئی، وہ وضع گئی، انداز گیا، اسلوب گیا

گھٹ گھٹ کے قیامت ڈھاتا ہے، رہ رہ کے دلِ ناکام مرا
آتے ہیں نظر آثار بُرے، کیا دیکھئے ہو انجام مرا
کم بخت بھلا ہو یا کہ بُرا، کہنے کے لئے اک مونس تھا
دل جب سے سدھارا پہلو سے، دنیا سے گیا آرام مرا

حسرت موہانی کا نام اردو غزل کے احیاء کے باعث نمایاں ہے۔ ایک ایسے نازک موڑ پر جب غزل اپنے اندازِ بیان اور موضوع کے اعتبار سے بے حرکت اور بے جان سی ہو چلی تھی، حسرت نے اس سطح پر ارتعاش پیدا کیا اور اسے زندگی سے قریب کر کے اس میں سچائی اور واقعیت پیدا کر دی جس کے نتیجے میں اس میں ایک نیا اور شگفتہ رنگ اور ایک نئی رنگینی و رعنائی پیدا ہو گئی۔

حسرت کی غزل میں حُسن پرستی ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے اور اس معاملے میں ان کی یہ انفرادیت ان کے ساتھ مخصوص ہے کہ ان کا یہ جذبہ روایتی اور آسمانی نہیں بلکہ اس کی نوعیت سراسر انسانی ہے۔ انسانی حُسن کو حسرت نے صنفِ لطیف میں دیکھا ہے اور حسرت کا محبوب گوشت پوست کا ایک عام فرد ہے جسے چھوا جا سکتا ہے اور پھر محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔ یوں حسرت کی غزل لمسیات سے عبارت غزل قرار دی جا سکتی ہے، مگر یہ لمس ہوس پرستی سے پاک ہے بلکہ اس میں ایک خاص طرح کی لطافت جھلکتی ہے۔ حسرت کی غزل میں جسم کی آنچ ضرور محسوس ہوتی ہے مگر وہ انسانی دل و دماغ کو بہکاتی نہیں بلکہ جنس کا ایک صحت مندانہ تصور پیدا کرتی ہے۔

حسرت کے عشق اور بیانِ عشق میں ایک خاص طرح کی تہذیب کا پر تو ملتا ہے جہاں عاشق بھی حیادار ہے اور محبوب بھی؛ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ محبوب

کی حیا داری نے ہی عاشق کو حد سے آگے بڑھ جانے سے روک رکھا ہے۔ حسرت کے محبوب کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں :

"حسرت کا محبوب متوسط طبقے کی وہ لڑکی ہے جو صاف چھپتی بھی نہیں، سامنے آتی بھی نہیں کے مصداق محبت تو کرتی ہے لیکن کھلے بندوں اس کا اقرار اس لئے نہیں کرتی کہ ابھی پرانی قدروں کے احترام نے اس کی آنکھوں میں حیا کی رمق کو باقی رکھا ہے"۔(12)

حسرت کی غزل کی زبان بھی شستہ اور اسلوب بیان شگفتہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصرعے بول رہے ہیں۔ اس انداز میں ایک کیف سا محسوس ہوتا ہے جس میں بے خودی جھلکتی ہے مگر گم شدگی بالکل نہیں۔ اس وسیلے سے حسرت نے اردو غزل کے دھارے کو ایک نیا رخ اور ایک نئی جہت عطا کی۔ یوں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حسرت نے نہ صرف غزل کے دم توڑتے وجود میں زندگی کا نیا خون داخل کیا بلکہ ذاتی جذبات اور عصری ماحول کو غزل میں سمو کر اپنی نوعیت کا ایک رجحان پیدا کیا۔

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبئی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جُنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھے، ہم اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار!
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم ۔۔۔ سیہ کار تھے، باصفا ہو گئے ہم
جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا ۔۔۔ تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

اردو زبان کے ایک اور بڑے شاعر فانی نے اپنے اظہار کے لئے غزل کا انتخاب کیا تو یہ ان کے مزاج اور شخصیت کا نفسیاتی اظہار محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک غم رسیدہ اور بے دل شخص تھے اور حالِ دل چھپانے کے خوگر تھے۔ اس صورت میں اظہار کے لئے نظم کے مقابلے میں غزل زیادہ موزوں ہوتی ہے جس میں اختصار، ابہام او اشاریت شامل ہوتی ہے اور اظہار کے ساتھ ساتھ اخفا کا سلیقہ بھی کسی قدر باقی رہتا ہے۔

فانی کی غزل میں قنوطیت کی حد تک پہنچی ہوئی، مایوسی جھلکتی ہے۔ ان کے نزدیک موت ایک عالمگیر حقیقت اور غم ایک بسیط آفاقی عنصر ہے۔ وہ زندگی سے بھرپور منظر دیکھتے ہوئے بھی موت کے تصور سے نجات حاصل نہیں کر سکتے...... یوں اگر رشید احمد صدیقی نے حالی کو "یاسیات کا امام" (13) کہا ہے تو اس میں کوئی مبالغے والی بات نہیں۔ حالی کے ہاں میر کا غم اور غالب کا فکر جمع ہو گیا ہے اور اس سے جو رنگ پھوٹا ہے

وہ فانی کا انفرادی رنگ ہے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول :

> "ان کے یہاں غالب کے تفکر اور میر کی جذبات پرستی کا حسین امتزاج ہے۔ وہ صرف حسن و عشق اور اس کی کیفیات کی ترجمانی ہی نہیں کرتے، ان پر غور و فکر بھی کرتے ہیں"۔(14)

فانی کے یہ اشعار ان کے شعری مزاج اور شخصیت کی مکمل عکاسی کرتے ہیں :

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل بھی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اردو کے ایک اور اہم شاعر اصغر گونڈوی کا کلام بہت مختصر لیکن منتخب ہے۔ یہ وہی وصف ہے جو میر درد کے ساتھ بھی مخصوص ہے۔ اصغر اور درد کے ہاں ایک اور

عنصر بھی مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں کا کلام صوفیانہ اور اخلاقی ہے۔ اصغر کے کلام کا سب سے نمایاں وصف پاکیزگی اور لطافت ہے اور اس کا انداز تازہ محسوس ہوتا ہے۔ تصوف کی عمومی پژمردگی اور یاس و حسرت کی بجائے ان کے ہاں رقص اور وجد و کیف کا ذائقہ ملتا ہے۔ ان کے اشعار زندگی کی سنگینیوں سے فرار نہیں سکھاتے بلکہ شرافت اور پاکبازی کے ساتھ زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ روایتی تصوف کی طرح ان کے ہاں تھک کر بیٹھ جانے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ کچھ کرتے رہنے کا انداز جھلکتا ہے۔

مستی سے تیرا جلوہ خود غرضِ تماشا ہے
آشفتہ مزاجوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا
ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا ہی ذوقِ نظر دیکھا!

جانِ نشاطِ حسن کی دنیا کہیں جسے
جنت ہے ایک، خونِ تمنا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرمِ روِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے، دنیا کہیں جسے

حسرت، اصغر اور فانی کے عہد کی ایک اور ممتاز غزل گو شخصیت جگر مراد آبادی کی ہے۔ ان کی غزل قدیم رنگِ تغزل اور دورِ جدید کے احساس کا نمونہ ہے۔ اصغر زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں لیکن جگر زیادہ تر

خوشگوار پہلو سے متاثر ہوتے ہیں۔ جگر نے وارداتِ حسن و عشق، کیف و سرور میں ڈوب کر کہی ہے۔ جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ ان کی غزل میں "قال" کی بجائے "حال" ہے۔ ایک خاص طرح کا والہانہ آہنگ ہے جس میں نغمگی اور غنائیت کا اثر ملتا ہے۔ جگر کی غزل ایک زندگی آمیز حرارت سے عبارت ہے۔ جس میں سرشاری بلکہ بےخودی کا سا احساس جھلکتا ہے۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا، ان کو پیار آ ہی گیا
ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا!!
جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں
ہم ان میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں
میں اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ میں بھی
تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

یاس یگانہ چنگیزی "غالب شکن" کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ درجے کی شاعرانہ صلاحیتوں کو مناقشوں اور مجادلوں میں ضائع کر دیا۔ اردو غزل میں ان کا انداز سب سے الگ اور منفرد ہے جس میں انا کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ یہ انا ان

کے ہاں جرأت آموز اور حیات آفریں لب و لہجے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ جس سے ان کی غزل حرکت اور توانائی سے بھر پور اور روایت سے کھلی بغاوت کی آئینہ دار ہے۔ یوں یہ کہنا مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے بعد یگانہ وہ شاعر تھے جس نے اردو غزل کے روایتی مریضانہ قسم کے لہجے کو بدل ڈالا۔ یگانہ کا تخیل بڑا زرخیز ہے، جہاں سے حقائق و معارف کی فصلیں بھی کثرت سے پھوٹتی ہیں۔ وہ حادثات سے گھبراتے نہیں بلکہ ان کو جھیل لینے میں زیادہ عافیت محسوس کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم نہیں کیا بلکہ حوصلے کے زادِ سفر سے دکھوں کے طویل اور کٹھن فاصلے طے کئے ہیں۔

یگانہ کی شاعری کے بارے میں سلیم احمد کی رائے بڑی معنی خیز ہے جس کے مطابق یگانہ معاشرے کی موجود اقدار کے مقابلے میں اپنی انفرادی اقدار کا اثبات چاہتا ہے اور ان دونوں قسم کے انداز میں ملاپ کی کوئی صورت دشوار نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> "یگانہ کی شاعری میں ہم ایک ایسے فرد سے دوچار ہوتے ہیں جس کا رشتہ روایتی اقدار سے ٹوٹ چکا ہے اور اس نے جو اپنی انفرادی اقدار قائم کی ہیں، ان کا اس کے زمانے سے ایسا شدید تصادم ہے کہ ہم آہنگی کی صورت نہیں نکلتی...... یگانہ اپنے بل پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور خود کو اس حد تک خود مکتفی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ عالمِ خارجی سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے"۔(15)

یگانہ کے اشعار خود بول بول کر اپنے خالق کی گواہی دیتے ہیں۔

بندۂ فطرت، مجبور ہوں، مختار نہیں

ہاں ندامت میں ہے شک، جرم سے انکار نہیں

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا

پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

ازل سے تیرا بندہ ہوں، ترا ہر حکم آنکھوں پر

مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے

بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

جدید اردو غزل میں فراق کی آواز بڑی توانا ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے پھر عزیز اور صفی کا اثر ابھرتا ہے اور پھر غالب اور میر کا انداز بھی پھوٹتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ سارے رنگ اور اثرات مل کر فراق کا اپنا رنگ بنتے گئے۔

فراق کی غزل کا مرکزی نکتہ عشقیہ اور عام زندگی کے بارے میں ایک ذوقی اور وجدانی ادراک ہے۔ حسرت اور فراق کا موازنہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے ہاں عشق کی نوعیت جسمانی ہے لیکن اس کا اظہار دونوں کے ہاں مختلف ہے۔ حسرت کا عشق آسودہ اور فراق کا جذبہ شوقِ تشنہ محسوس ہوتا ہے۔ فراق کے عاشق اور محبوب کے درمیان ایک ایسی قسم کی تنہائی کا وجود حائل نظر آتا ہے جس کو وصل کا لطف اور حدت بھی تحلیل نہیں کر سکتی۔ محمد حسن عسکری اسی حوالے سے لکھتے ہیں۔

"فراق کی شاعری کا بنیادی مسئلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے

کہ محبوب کو پاکر بھی اس سے وصال اور مکمل یگانگت کا

احساس حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ عاشق

اور محبوب کے درمیان ہزار خلوص اور تپاک سہی، لیکن دو

انسانی شخصیتیں ایسی متوازی لائنیں ہوتی ہیں جو کوشش

کے باوجود ایک دوسرے سے نہیں مل سکتیں"۔(16)

حسرت نے بیانِ عشق میں بدلتی ہوئی نفسیات کا لحاظ قائم کیا تھا۔ فراق نے اس سلسلے کو کچھ اور آگے بڑھا دیا اور اس میں کچھ نئے وسعتوں کے امکانات شامل کر دیئے۔ ان نئی وسعتوں کا تعلق دراصل ان رجحانات اور رویوں سے ہے جو نئی معاشرت تشکیل دے رہے تھے۔ غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا بیان...... فراق کے لئے کوئی نیا تجربہ تو نہیں تاہم اس بیان سے وہ تمام رنگا رنگ اور بھرپور تجربے سمٹ آئے ہیں جو فراق جیسے فنکار کا حصہ ہو سکتے ہیں۔ اس نے روایت کو یکسر رد نہیں کیا لیکن اسے عقیدے کا بے جان پتھر بھی نہیں بنایا بلکہ اس کو محض ایک توانا پس منظر کے طور پر قبول کیا ہے۔ جس سے ان کی غزل نئے شعری موسموں کی چاپ بنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس میں کچھ اثر...... دور کہیں پس منظر میں، پرانی آوازوں کا بھی ہے۔

فراق کی مغرب کے جمالیاتی شعور سے بھی شناسائی تھی جس کے وسیلے سے انہوں نے اپنے ہاں شعری تجربوں بالخصوص ہیئتی تجربوں کو شامل کیا ہے۔ بے شمار اشارے وضع کر کے علامت کے تجربوں کو بھی برتا ہے اور اظہار کے متنوع اسالیب کو جنم دیا ہے۔ اس صورت حال سے ان کے ہاں زبان کے حوالے سے ایک رنگا رنگی سی پیدا ہوئی ہے جس کو رشید احمد صدیقی نے ایک طرح کی مجذوبیت قرار دیا ہے۔ جس میں الفاظ، محاوروں اور مختلف بولیوں کے استعمال سے جہاں مروجہ لسانی ساخت کی نفی ہوتی

ہوئی محسوس ہوتی ہے وہاں اشعار کھلتے ہوئے جذبات کا عکس بھی نظر آتے ہیں۔ جس کی طرف رشید احمد صدیقی نے اشارہ کیا ہے :

"زبان کے معاملے میں فراق کچھ دنوں سے مجذوب ہو
چلے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ شریعت کے اس قانون سے
بھی واقف ہوں گے کہ مجذوب ہوش میں نہ آئے تو اسے
قتل کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مصلح کو مجذوب پر
ترجیح دیں گے"۔ (17)

فراق نے اس مجذوبیت کو ختم کیا یا نہ کیا' یہ ایک الگ بات ہے' تاہم ان کے ہاں عمدہ اشعار کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے، اے دوست
آہ! اب مجھ سے تیری رنجشِ بے جا بھی نہیں

نرم نرم ہوا اور جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

فراق کے بعد غزل گو شعراء کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں فیض، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیار پوری، سیف الدین سیف، یوسف ظفر، باقی صدیقی اور ناصر کاظمی کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان شعراء کے ہاں فکر و خیال کے نئے زاویوں کے علاوہ اسلوب و اظہار کے بھی نئے نئے افق دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے رجحانات میں سیاسی و سماجی زندگی میں رونما ہونے والے مدوجزر اور روحِ عصر کا ایک نیا اور رچا ہوا شعور بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ان شعراء میں سے بیشتر ایسے ہیں جو غزل گو ہونے کے علاوہ اچھے نظم گو بھی ہیں اور اس عہد میں اردو نظم موضوع کے حوالے سے بالعموم اور ہیئت کے اعتبار سے بالخصوص نئے تجربوں کی زد میں تھی، اس لئے غیر محسوس طور پر ان کی غزل بھی ان نئے اثرات سے متاثر ہوئی جس سے جہاں موضوعات کا روایتی لباس بدلا وہاں اظہار کا لگا بندھا رویہ بھی تبدیل ہوا۔ نئی لسانی تشکیلات جہاں جدید نظم کے حصے میں آئیں، وہاں اردو غزل بھی اس تجربے سے روشناس ہوئی اور نئے لفظ، نئے استعارے اور نئی تشبیہیں غزل کے قالب میں شامل ہوئیں۔ ساتھ ہی زندگی کو کچھ نئے حوالوں سے دیکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔

نئی غزل کے اس منظر نامے میں کچھ شعراء ایسے بھی ہیں جو تقسیم 1947ء کے تاریخی واقعے سے براہِ راست متاثر ہوئے جس کے نتیجے میں ان کی غزل کبھی تو بچھڑے ہوئے دیاروں کی یاد بنتی نظر آتی ہے اور کبھی نئی آبادیوں کے حوالے سے کچھ اندیشوں کا اظہار کرتی ہے۔ تاہم مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان شعراء نے روایت کو محض ایک طاقتور پس منظر کے طور پر قبول کیا اور نئے طرزِ احساس

اور نئے اسالیب کے ذریعہ اردو غزل کو نئی زندگی کا ترجمان بنایا۔

شعر وادب کے اس زرخیز سلسلے میں فیض کا نام بہت نمایاں ہے۔ فیض کی شہرت غزل اور نظم دونوں حوالوں سے ہے۔ اس کے ہاں رومان اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس نے ایک خیالی دنیا بنائی ہے جس میں وہ زندگی سے فرار کے بعد پناہ لینا چاہتا ہے۔ تاہم یہ احساس اس کے ہاں رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور ایک ایسے رجحان پر ختم ہوا جسے "رومان انگیز حقیقت پسندی" کہا جا سکتا ہے۔ عالمی سیاسی شعور نے بھی فیض کے شعری وادبی تناظر میں بے پناہ وسعت پیدا کی ہے۔

فیض کے ہاں حسن کا ایک واضح احساس ملتا ہے جس میں کسی جنسی الجھن کا سایہ تک نہیں۔ فیض کی انفرادیت کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ انتہائی شدید جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے بھی اپنے لب ولہجے میں تیزی اور جھنجلاہٹ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ فیض کی غزل اس نئے انسان کی نفسیات کی عکاسی کرتی ہے جو رومانی طور پر بے حد آسودہ ہے جس کے لئے زندگی کے تجربات کے خوشگوار پہلو ہی قابلِ اعتبار اور قابلِ احترام ہیں۔ وہ پہلو اس کے لئے بہت ہی کم اہمیت رکھتے ہیں جن کے بطن میں زندگی کے حقیقی تجربوں کی تلخی گھلی ہوئی ہے۔ اس لئے سلیم احمد کہتے ہیں :

> "فیض صاحب کے یہاں عورت کے بجائے دو "جذباتی وجودوں" کا اشتراک ہوتا ہے جو اپنی پوری زندگی سے منقطع ہو کر خوش وقتی کے لئے شام کو جمع ہوتے ہیں اور افسردہ کن میٹھی میٹھی باتوں سے لطف لیتے ہیں"۔ (18)

لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ خوش وقتی اور رومان کا ایک محدود سا تجربہ جس کی جانب سلیم احمد نے بھی اشارہ کیا ہے، فیض کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔

بڑھتے ہوئے عالمی، سیاسی اور سماجی شعور نے ایسے رجحانات کو اگر یکسر ختم نہیں کیا تو ان میں وسعت اور ہمہ گیری ضرور پیدا کی ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ فیض نے بعض قدیم اور مروجہ علامتوں کو نئے مفاہیم سے آشنا کر کے ان کی وسعت اور دائرۂ کار میں اضافہ کر دیا ہے۔ "گل"، "دار"، "قفس"، "چمن"، "صیاد"، "دشمن" اور "چارہ گر" جیسی علامتیں جو اردو غزل کی روایت میں جابجا نظر آتی ہیں، فیض کے ہاں روایتی مفہوم کی بجائے نئے سیاق وسباق اور نئے معانی کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں، جن کی نوعیت زیادہ تر سیاسی ہے۔

فیض کے یہ اشعار اس کے مخصوص نرم ولطیف اور سبک انداز کی عکاسی کرتے ہیں، جو اس کی شاعری کا منفرد رنگ ہے۔

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر اسے آج ہم نے چکا دیا

دل میں اب یوں تیرے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گزرے، شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دُکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

احمد ندیم قاسمی کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے اقبال کے رنگِ تغزل سے رشتہ استوار کرنے کے باوجود حسرت اور فراق سے وہ سب کچھ سیکھا ہے جو ندیم جیسا شاعر سیکھ سکتا ہے۔ ندیم کی غزل میں جلال و جمال کی کیفیت جھلکتی ہے۔ شرف انسان اور عظمتِ انسان کا گہرا احساس اور سلجھا ہوا اور سنجیدہ اظہار ندیم کی غزل کا خاص انداز ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ندیم کی شاعری کے انہی پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے۔

> "ندیم کے کلام کو پڑھ کر عموماً میرے خیال میں شاعر کی ایک خاص تصویر ابھرتی ہے، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک ایسے شخص کو دیکھ رہا ہوں جو فکر مند مگر متبسّم ہے...... سیپیاں چننے والا، جگنوؤں سے کھیلنے والا، چاند سے ہم کلام ہو کر اندھیروں کو بھگانے والا، سحر، آفتاب اور دن کا جوئندہ، ندیوں کے کنارے پھرنے والا مگر شہروں کی زندگی اور اس کے مسئلوں سے پھر بھی وابستہ...... مشفق اور شفیق جس کے ماتھے پر سنجیدگی کی گہری لکیر ہے"۔(19)

ندیم کی غزل واضح طور پر دو رجحانات کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک رجحان وہ ہے جس میں ندیم کسی نہ کسی نظریے کا داعی اور مبلغ دکھائی دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر

سیاسی وسماجی شعور بھی ہے جو اس کے ہاں جھلکتا ہے۔ دوسرا رجحان وہ ہے جس میں خیال وخواب کی تصویریں ملتا ہے تاہم یہ تصویریں خواب کی تصویریں ہونے کے باوجود حقیقت کے عکس سے محروم نہیں ہیں۔ یوں ندیم کو فکر اور رومان...... دونوں سطحوں کا شاعر کہا جاسکتا ہے۔

میں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں تُو فرطِ حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی

ابھی انسان کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
مہر ومہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی

ابھی نسلوں کے اک، انبوہ میں محبوس ہوں میں
آدمیت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی

مری شکست میں انسانیت ہے نالہ کُناں
یہ سانحات فقط میرے سانحات نہیں

میں گل کو دیکھ کے تخلیقِ گل کی سوچتا ہوں
گلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں

یہ راستے تو مرے ہاتھ کی لکیریں ہیں
جو تو رفیقِ سفر ہے تو رات، رات نہیں

اس زرخیز سلسلے کا ایک بڑا شاعر ناصر کاظمی ہے جو تقسیم کے آس پاس شعروادب کے افق پر نمودار ہوا۔ اس کے سامنے اردو غزل کی روایت کا ایک طویل اور عظیم دھارا تھا۔ اس نے اسی روایت سے فیض حاصل کیا مگر اس میں اپنے ذاتی تجربات اور

اظہار کے کچھ اپنے پیمانے شامل کر کے وہ جدید شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کا مستحق ٹھہرا۔ کہنے والے اسے صرف ناسٹلجیا کا اسیر شاعر قرار دے کر اور غزل کے ایک بڑے شاعر میر کا پیرو قرار دے کر فارغ ہولیں گے...... مگر غور کریں اور تجزیہ کریں تو وہ ان دو مخصوص حوالوں کا امانت دار ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس نے اردو غزل کی تجدید کی اور اس میں ایسے امکانات داخل کئے جو جہاں ایک طرف روایت میں خوبصورت اضافہ بنے تو دوسری طرف آنے والے زمانوں میں غزل کیلئے زندہ رہنے کا جواز بھی ثابت ہوئے۔ ناصر کی غزل کی اہمیت کچھ اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس کی غزل اس کی زندگی کی حقیقی تصویر ہے۔ وہ سر تاپا شاعر تھا جو تخلیقی سطح پر جیتا تھا اور اسی پر جی سکتا تھا۔ اسکی آواز میں اتنی توانائی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے معاصرین میں ممتاز دکھائی دیتا ہے بلکہ آج بھی دلچسپی اور توجہ سے سنا اور پڑھا جاتا ہے۔)

حوالہ جات

1- احمد ہمدانی' جدید غزل' غالب سے آج تک' فنون' جدید غزل نمبر' ص 76

2- عبادت بریلوی' غزل اور مطالعۂ غزل' ص 441

3- عابد علی عابد' اصول انتقاد' ادبیات' ص 373

4- ڈاکٹر فرمان فتح پوری' جدید اردو غزل' غالب سے حالی تک' نگار' (جدید شاعری نمبر) ص 201

5- الطاف حسین حالی' مقدمۂ شاعر و شاعری' ص 128

6- سلیم احمد' ادھوری جدیدیت' ص 14

7- فراق گورکھپوری' انداز ے' ص 249

8- ڈاکٹر عبادت بریلوی' غزل اور مطالعۂ غزل' ص 480

9- فتح محمد ملک' غزل اور نئی غزل' ادب لطیف' سالنامہ 1964ء' ص 59

10- نظیر صدیقی' "جدید غزل..... پاکستان اور ہندوستان میں" فنون' جدید غزل نمبر' ص 149

11- ڈاکٹر سلیم اختر' اقبال کا نفسیاتی مطالعہ' ص 195

12- ڈاکٹر وزیر آغا' "حسرت کا عشق" نگار' حسرت نمبر' ص 234

13- بہ حوالہ' ڈاکٹر اے وحید' تذکرۂ جدید شعرائے اردو' ص 445

14- ڈاکٹر عبادت بریلوی' غزل اور مطالعۂ غزل' ص 501

15- سلیم احمد' ادھوری جدیدیت' ص 28

16- محمد حسن عسکری' "اردو شاعری میں فراق کی آواز" فنون' جدید غزل نمبر' ص 299

17- رشید احمد صدیقی' "جدید غزل" افکار' جدید شاعری نمبر' ص 119

18- سلیم احمد' ادھوری جدیدیت' ص 30

19- ڈاکٹر سید عبداللہ' "احمد ندیم قاسمی' جو کہ شاعر بھی ہے' انسان بھی ہے"
سخن ور نئے اور پرانے' ص 193

باب سوم

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن

(ناصر کاظمی کی غزل کا معنوی اور فنی جائزہ)

پس منظر

انسانی زندگی ہمیشہ تبدیلیوں سے دوچار رہی ہے' تبدیلی کے اس مسلسل عمل کے وسیلے سے انسانی خیالات اور فکری وذہنی سرمایے میں تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہی ہیں اور ان میں اضافے بھی ہوتے رہے ہیں۔ شعر وادب کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ موضوعات اور ہیئت کے حوالے سے یہ دنیا بھی تبدیلیوں کی زد میں رہی ہے۔ جیسے جیسے انسانی شعور میں یہ تبدیلیاں آتی رہی ہیں' ویسے ویسے شعر وادب کے پیمانے اور اس میں فکر وخیال کے دھارے اپنا رخ تبدیل کرتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک صنف مقبول رہی ہے تو دوسرے کسی زمانے میں کوئی اور صنف قبولِ عام کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اُردو کی اصنافِ سخن میں غزل ایک ایسی صنف ہے جو کئی دوسری اصناف کے مقابلے میں بڑی سخت جان واقع ہوئی ہے۔ یہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کی مقبولیت میں بھی کمی نہیں آئی' البتہ یہ ضرور ہے کہ فکر وخیال اور اندازِ بیان کی ندرت اور جدت ہی کی وجہ سے یہ صنف مقبول رہی ہے اور وہی شاعر غزل کی روایت میں قابلِ ذکر ہیں' جن کے ہاں طرزِ احساس یا اندازِ بیان کا نیاپن ملتا ہے۔ ناصر کاظمی کا شمار بھی انہی شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک ایسے وقت میں اُردو غزل کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیا جب اس میں خستگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ یہ اُردو نظم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں اردو

غزل کے وقار کی حالی کا مسئلہ تھا جسے ناصر کاظمی نے اپنی شعری صلاحیتوں کے ذریعے حال کیا۔

انیسویں صدی اسلامیانِ ہند کی زندگی میں ایک فیصلہ کن اور بامعنی سنگِ میل کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نشاۃِ ثانیہ کا ایک عمل تھا جس نے شعر و ادب میں ابلاغ بلکہ زیادہ سے زیادہ ابلاغ کی ضرورت پیدا کی اور یہ اسی رجحان کا نتیجہ تھا کہ نظم گوئی عام ہونے لگی، اس زمانے میں حالی نے وسیع تر مقصدیت کے نقطہ نظر سے "مسدس مدو جزر اسلام" لکھی۔ پھر لاہور میں انجمنِ پنجاب کے زیر اہتمام نئی نظم کی تحریک شروع ہوئی تو حالی اور آزاد اس میں پیش پیش تھے۔ حالی اور آزاد کے بعد اقبال نے نظم گوئی کو کچھ اور تخلیقی جہتیں عطا کیں اور اظہار و ابلاغ کے نئے امکانات سے اردو نظم کو مالا مال کر دیا۔ جوش، حفیظ جالندھری، روش صدیقی، اختر شیرانی، اور احسان دانش جیسے شاعروں نے بھی کم و بیش اپنے اظہار کے لئے نظم کا پیرایۂ اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سارے سفر کے دوران اردو غزل کا دھارا یکسر رک گیا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک مخصوص سیاسی و سماجی فضا نے غزل کی بجائے نظم کو اولیت دینے کا رجحان اس لئے پیدا کیا کہ ابلاغ مقصود تھا۔ غزل بھی ابلاغ کے عنصر سے کبھی خالی نہیں رہی. لیکن اس کی رمزیت اور ایمائیت کی تفہیم کے لئے بہر حال نظم سے زیادہ کاوش کی ضرورت ہے اور انیسویں اور بیسویں صدی کے وہ شب و روز غزل کی تفہیم کی کاوشوں سے زیادہ ملی و قومی اعتبار سے جدوجہد کے متقاضی تھے...... غالباً یہی وجہ تھی کہ شعراء نے غزل گوئی تو ضرور کی لیکن نظم کہنے کا رجحان غالب رہا۔

نظم گوئی کی یہ روایت 1930ء تک اس ڈگر پر چلتی رہی جس پر اقبال، جوش اور حفیظ نے اس کو چلایا تھا۔ اس کے بعد ہر آن بدلتی ہوئی صورتحال کے نتیجے میں ابھرنے

والے نئے احساس نے نظم کا یہ قالب بھی تبدیل کر دیا اور اس میں نئے تجربوں کا عمل اس شدت کے ساتھ شروع ہوا کہ اردو نظم کی وہ روایت بالکل ایک نئے احساس اور شعور سے دو چار ہوئی' جو حالی سے شروع ہو کر اقبال سے ہوتی ہوئی آئی تھی۔ ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالد اور میراجی اس نئے احساس اور شعور کے اولین داعی تھے۔ نئی انسانی صورتحال کے پیش نظر انہوں نے غزل کی بجائے نظم اور اس سے بڑھ کر "نظم آزاد" کا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ نہ صرف معنوی اعتبار سے نیا تھا بلکہ اظہار و ابلاغ کے حوالے سے بھی بالکل مختلف تھا۔ اس تجربے کی معنویت کا دائرہ نئی انسانی زندگی کی تہہ در تہہ پیچیدگیوں اور بو قلموں کیفیات کے گرد گھومتا تھا۔ "نظم آزاد" کی امیجری نئی تھی، لفظوں کا برتاؤ نیا تھا، تشبیہات اور استعارات بھی نئے تھے اور یوں سب کچھ نیا تھا جو نئی نظم کی روایت کے سمندر کے لئے ایک بھاری پتھر ثابت ہوا۔ "نظم آزاد" روایت سے یکسر بغاوت کا وہ عمل تھا جس کے اثرات آج کے شعری منظر نامے میں بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم کہنے کا رجحان غالب رہا۔ اس تحریک کے پیش نظر بھی کچھ مقاصد اور نصب العین تھے جس کے باعث ابلاغ کی ضرورت ناگزیر تھی۔ ترقی پسندوں نے روایت کے پس منظر سے کامل انحراف کی بجائے اس میں اظہار و ابلاغ کے کچھ ایسے امکانات شامل کر دیئے جن کی نوعیت نئی قرار دی جا سکتی ہے یوں ترقی پسندوں نے نئے حسی تجربات کے لئے نظم کو برتا۔ دراصل یہ عہد تجربوں کا عہد قرار دیا جا سکتا ہے جس نے اُردو شعر و ادب کے دھارے کو نئی تبدیلیوں سے روشناس کرایا۔

"اصل بات یہ ہے کہ 1936ء سے 1946ء تک دس سال کا عرصہ اردو شاعری کی تاریخ میں بغاوت اور

تجربوں کا ایک طوفانی دور ہے، موضوعات میں بغاوت اور
تجربوں کا سلسلہ تو دور تک پہنچتا ہے' ہئیت میں بغاوت کا
احساس اس کے بعد پیدا ہو گیا۔ وہ پہلے پہل چند انفرادی
کوششوں تک محدود رہتا ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے
ساتھ یہ بغاوت پھوٹ پڑتی ہے ...... نظم آزاد، گیتوں، نئی
بحروں، نئے نئے پیمانوں کے تجربے شروع ہوتے
ہیں"۔(1)

ناصر کاظمی کی غزل......ایک منفرد آواز

اس مختصر سی بحث سے شاید یہ شائبہ ہو کہ نظم گوئی کے اس سیلاب میں اردو غزل اپنا سب کچھ ضائع کر چکی تھی۔ دراصل ایک تو نظم کا سیلاب بڑا تند و تیز تھا جس نے شاعری کی پہلے سے بنائی ہوئی عمارت کو متزلزل کر دیا تھا اور کچھ غزل بھی قدرے کمزور ہو چکی تھی۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے آس پاس سیف الدین سیف غزل لکھ رہے تھے فراق کی آواز بھی سنی جا رہی تھی۔ حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی بھی زندہ تھے اور اپنے طور پر غزل لکھ رہے تھے لیکن حسرت اور جگر کی غزل اسی روایتی انداز کی تھی جس کو اردو کی نئی نظم کی مقبولیت نے گہنا دیا تھا۔ فراق کی غزل میں کسی قدر توانائیاں تھیں لیکن اس آواز کا اثر ابھی عام نہ ہوا تھا۔ اور یوں غزل اپنی وقعت کھو رہی تھی۔ روایت کا سہارا کہاں تک ساتھ دے سکتا تھا؟...... یہی وجہ تھی کہ نئی نظم جس کے لئے راشد، خالد اور میراجی جیسے شاعر برسرِ عمل تھے رفتہ رفتہ قبولِ عام کا درجہ حاصل کر رہی تھی اور ادھر غزل کی اہمیت قدرے کم ہو رہی تھی۔ اس نازک موقع پر ناصر کاظمی نے اردو

غزل کو نئی حرکت عطا کی اور ایک ایسا لہجہ عطا کیا جس نے غزل کی گم ہوتی ہوئی آواز کو ایک بار پھر زندگی کا اعتبار بخشا۔

نظم گوئی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے اس عرصے میں ناصر نے نظم کی بجائے غزل لکھی تو اس میں جہاں ناصر کاظمی کے مزاج کو دخل ہے وہاں اس حقیقت کا شعور بھی شامل ہے کہ :

> "غزل مسلمانوں کی عہد در عہد اجتماعی شخصیت کا حسین ترین آئینہ ہے"۔(2)

برصغیر کی زمین اپنے مزاج اور خمیر کے اعتبار سے نظم سے زیادہ غزل کے لئے موزوں محسوس ہوتی ہے۔ نظم میں مربوط خیالی اور خیال وفکر کی تنظیم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جب کہ برصغیر کے انسانوں کا عمومی مزاج ربط و تنظیم کی بجائے انتشار اور بے ترتیبی سے تشکیل ہوا ہے اور اس کی وجہ وہ سیاسی و سماجی انقلابات ہیں جنہوں نے برصغیر کے انسانوں کو چین سے بیٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کو ترتیب اور تنظیم کی فرصت بہت ہی کم ملی ہے، اس لئے اگر اس کے احساس کا اظہار منتشر انداز میں ہوا ہے تو اس کے لئے غزل سب سے بہتر وسیلہ تھی۔ نظم اس منتشر اظہار کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو غزل میں برصغیر کے مزاج اور تہذیب کی عکاسی بھرپور انداز میں ملتی ہے۔

> "......غزل کی ساحری سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے۔ وہ ہمارے قومی مزاج اور ذہانت و فطانت کی ترجمان ہے۔ اس میں ہماری تہذیب اپنی تمام پہلودار کیفیت کے ساتھ بے نقاب ہے۔ گزشتہ دو تین سو سال کی ہماری قومی

تاریخ میں اس نے جذباتی اور جمالیاتی اعتبار سے افراد کے
لئے آسودگی اور طمانیت کا بڑا سامان پیدا کیا ہے"۔(3)

نظم کی بجائے غزل کا راستہ اختیار کرنے کے حوالے سے ناصر کاظمی کی اپنی
رائے شاید زیادہ مناسب ہو گی۔

"غزل تو اتفاقیہ ایک صنف مجھے پسند تھی، چوں کہ میرا
ایک پس منظر تھا اس میں میں نے زیادہ تر غزل کی شاعری
پڑھی، پھر یوں دیکھیئے کہ اردو کا بہترین سرمایہ تو غزل میں
ہی ہے، تو جس زمانے میں میں نے شعر کہنا شروع کئے
اسلامیہ کالج لاہور میں میں تھا۔ یہاں فیض احمد فیض
راشداور میرا جی کا طوطی بول رہا تھا اور اس کے بعد
دوسری نسل تھی، یوسف ظفراور ان کے ساتھی۔ غزل
واقعی مشاعرے میں پڑھنا بہت مشکل تھا(نظم کی
مقبولیت کے باعث) لیکن یہ ہے کہ میں ترنم سے پڑھا
کرتا تھامیرے ساتھ حمید نسیم، حفیظ ہوشیار پوری تھے،
ان کو بھی بڑے ادب سے سنا جاتا تھا...... لیکن دراصل میں
نے غور کیا کہ غزل کے خلاف لوگ نہیں تھے بلکہ غزل
میں کلاسیک کی پرانی ڈگر جو تھی، اس کے خلاف تھے۔وہ
کہتے تھے کہ میاں نئی بات کرو، اگر غزل میں نئی بات کہی
جا سکے......اور میرا خیال ہے جو غزلیں کہی ہیں......میں
نے اپنی دانست میں یہ سوچ کر کہیں کہ وہ زمانے کے

تقاضوں کو پورا کریں اور اس میں میرے عصر کی روح

ہو"۔(4)

یوں ناصر کاظمی "نئی نظم" کے مقابلے میں "نئی غزل" کی بات کرتا ہے۔ یعنی وہ غزل جس میں روایت کا شعور تو ہو، تاہم اس میں نئے زمانے کے نئے تقاضوں کا اثر بھی شامل ہو اور اس میں اس حقیقت کا ادراک موجود ہو کہ زندگی کے بدلنے کے ساتھ انسان کے رویے اور رجحانات بھی تبدیل ہوئے ہیں اور شعر و ادب میں بھی ان بدلتے ہوئے رجحانات کی عکاسی ہو۔۔۔۔۔۔ یوں ناصر کی غزل دو بڑے حوالوں سے نظم کے سیلاب میں غزل کے وجود کے ثبات کا باعث بنتی نظر آتی ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ جب غزل ایک لحاظ سے غیر مقبول صنفِ سخن سمجھی جا رہی تھی، ناصر نے اسی کا انتخاب کیا اور دوسرے اس اعتبار سے کہ اس نے لگے بندھے روایتی انداز کی بجائے غزل کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔

غزل کو عشق و عاشقی کے روایتی اسلوب سے آزاد کر کے نئی دنیاؤں کا راستہ حالی اور اقبال نے دکھایا تھا۔ یہ نئی دنیائیں موضوعات کی وسعت کا استعارہ تھیں جس کی وجہ سے اردو غزل میں موضوعات کا تنوّع اور انداز بیان میں رنگا نگی پیدا ہونا شروع ہوئی۔

"غزل ایک ایسی صنف بھی معلوم ہوئی جو ایک قوم کی
ذہانت و فطانت کی پیداوار ہے جس نے ہمیشہ نہ صرف اس
قوم کے تہذیبی اور معاشرتی نشیب و فراز کا ساتھ دیا ہے
بلکہ اس نشیب و فراز کی ترجمانی اور عکاسی بھی کی ہے۔ اس
میں گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی باتیں ضرور ہیں لیکن ان
کے پردے میں اس نے بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔

معاشی، معاشرتی حالات کی تصویریں بھی کھینچی گئی ہیں ‘
بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر افراد کی جذباتی اور ذہنی
کیفیت کے نقشے بھی بنائے ہیں اور زمانے کے ہاتھوں
پیدا ہوتے ہوئے نت نئے افکار و خیالات کی عکاسی بھی کی
ہے“۔(5)

حقیقت پسندی کے اس نوع کے رجحانات نے حسن و محبت کے روایتی تصورات کی دیوار میں بھی دراڑیں ڈال دیں۔ ناصر کاظمی نے حسن و محبت کا یہ تصور ایک اور طرح سے اپنایا۔ اس نے غزل کی روایت کو اپنے ذاتی تجربوں کے ساتھ اس سلیقے کے ساتھ مربوط کیا کہ اس کا اپنا ایک اسلوب پیدا ہو گیا...... روایت کے اس عظیم تر دھارے میں اپنی انفرادیت کا نقش اجاگر کرنا خاصا دشوار تھا جس میں میر، غالب، اقبال اور فراق جیسے قد آور شعراء کی شاعری پڑھنے والوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہو...... لیکن اس نے خود کو اس آزمائش میں پورا اترنے کا اہل ثابت کیا۔ ان قد آور شعراء کی غزل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ناصر کاظمی کی غزل کے دریچوں کے پاس آ جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم تیز روشنیوں اور پر شور آوازوں کے منطقوں سے گزر کر ایک ایسے جزیرے میں آ گئے ہیں جہاں ہلکے رنگ اور دھیمی آوازیں ہیں، یہاں چاندنی کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے، یہاں خاموشی، تنہائی‘ اداسی اور رت جگے ہیں۔ دن کی مصروف زندگی کے پر شور ہنگاموں سے آزاد...... یہ دنیا وہ نئی دنیا ہے جہاں پھول، پہاڑ، درخت، ندیاں، راستے، لوگ اور مناظر سب کچھ مانوس اور شناسا ہے لیکن یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس انسیت اور شناسائی میں کچھ تبدیلی ضرور آئی ہے۔ مانوس اور شناسا چہروں کی یہی تبدیلی دراصل روایت سے حُسنِ قبول اور اپنی انفرادیت کے اثبات کا عمل ہے۔

ناصر نے روایت کے اس حسنِ قبول میں روایت کے جس سب سے بڑے شاعر کا انتخاب کیا، وہ میر ہے۔ میر کو ناصر نے محض از راہِ فیشن نہیں اپنایا بلکہ اس کی اور میر کی روحوں میں کہیں نہ کہیں مماثلت ضرور تھی۔ میر اور ناصر کاظمی کے زمانوں میں کچھ یکسانی تھی، کچھ مزاجوں کا میل بھی تھا، لیکن ناصر کاظمی میر سے حد درجہ قریب ہونے کے باوجود اس سے الگ وجود بھی رکھتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔

> "میں بھی میر صاحب کا رسیا ہوں، لیکن میر پرست نہیں، میں نے اگر میر صاحب کو مانا ہے تو بڑے جھگڑے اور فساد کے بعد...... میر اپنا جیون ساتھی ہے لیکن ایسا ساتھی جس سے ہر قدم پر جھگڑا رہتا ہے، مدت سے ہم ایک گھر میں رہتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں اور روٹھتے مَنتے رہتے ہیں"۔ (6)

روایت اور جدت کے رد و قبول کو ناصر کاظمی نے ایک اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

> "میں جب تازہ غزل کہتا ہوں تو میر کو بھی سناتا ہوں اور احمد مشتاق کو بھی"۔ (7)

نظم کی بے پناہ مقبولیت اور پذیرائی کے ماحول میں غزل کی آبرو کی بحالی اور روایت اور جدیدیت کے ایک صحت مند امتزاج کے ساتھ اپنی انفرادیت کے اثبات کے علاوہ اس بات کو بھی ناصر کی غزل کے نئے پن میں داخل سمجھنا چاہیئے کہ اس نے مختلف اندازِ فکر کی آمیخت سے ایک نئی سوچ کی تخلیق کی۔ ناصر کے ہاں ایک رومانی اسلوبِ فکر ہے جس کے وسیلے سے وہ خود کو ان حالات کے جنگل سے الگ کر لیتا ہے جو اس کے

مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ جس کے نتیجے میں فطرت کے مناظر و مظاہر اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے نظر آتے ہیں۔

"ناصر کاظمی کی شعری سلطنت مختلف منطقوں میں بٹی ہوئی ہے، تنہائی ، اداسی، فراق، یادیں، قدری زندگی کا تغیر، بچھڑنے والوں کی تلاش' ان دیکھے کی جستجو، ویرانی اور خرابے' اس سلطنت کے مختلف مطلے ہیں۔اس کی اس سلطنت کا نقشہ سہمے ہوئے شہروں، ٹھٹھری ہوئی راتوں، سونے راستوں، دکھ کے کنکروں اور کانٹوں، بے چراغ گلیوں، جلی ہوئی کھیتیوں ، پیاسی جھیلوں، بجھے دنوں کے ڈھیروں، خاموشیوں کے قفل' دھوپ کے سائبان، زخمِ وفا، آتشِ خاموش سے مرتب ہوتا ہے۔ناصر نے اپنی سلطنت میں بعض سیر گاہیں بھی بنائی ہیں جہاں انسانوں اور فطرت کا حسن اور معصومیت ، منہ اندھیرے چڑیوں کی چہچہاہٹ، چاند، ستارے ، شبنم، خوبصورت آنکھیں، پھول اور پھولوں جیسے انسان نظر آتے ہیں"۔ (8)

ناصر کی یہی شعری سلطنت اس کی غزل کو منفرد بنا دیتی ہے اور اسی سے اردو غزل کے گرتے ہوئے وجود کو سہارا ملا اور ایک ایسے وقت میں جب غزل گم نامیوں کے گھاٹ اتر چلی تھی' ناصر نے اپنی توانا شعری صلاحیتوں سے اس کے زوال کو روکا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ نئے زمانوں میں نئے لوگوں کی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور نظم کی روز افزوں مقبولیت کے مقابل ٹھہر سکے۔ جیلانی کامران نے اس نکتے کی بڑی

خوبصورت وضاحت کی ہے۔

"نظم کی مقبولیت نے غزل کے لئے جو دوراہا پیدا کیا، اس پر نہ صرف غزل کے تخلیقی مستقبل کا انحصار تھا بلکہ غزل کی پوری روایت کو بھی فکر کے اعتبار سے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اور آج جب ہم پچھلے تیس برسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ ناصر کاظمی کے ذریعے غزل نے ایک نیا اعتماد اور نیا مقام حاصل کیا ہے۔ ناصر کاظمی نے ہماری نسل کے لئے غزل کو قابلِ قبول اور قابلِ اعتبار ٹھہرایا اور اس طرح اپنے زمانے میں اس امر کی شہادت دی کہ غزل شعری طور پر شاید کبھی متروک نہیں ہو سکتی۔ ناصر کاظمی کی یہ شہادت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ادبی اور فکری ادارے کے طور پر غزل کی افادیت مسلّم ہے۔ اگر ایک ادارے کی حیثیت سے غزل کی اہمیت ثابت ہے تو ہماری تہذیب کے دوسرے ادارے بھی ویسے ہی تخلیقی اور جان دار ہیں جیسے غزل اس دور میں ثابت ہوئی ہے۔ ادبی تاریخ کے اندر کام کر کے ناصر کاظمی نے ہمارے تہذیبی اور فکری اداروں کی تصدیق فراہم کر دی ہے"۔ (9)

ناصر کی غزل...... اس کی زندگی کا آئینہ

ناصر کاظمی نے جدید اردو نظم کے مقابلے میں اردو غزل کو اعتماد بخشا۔ یہ اعتماد اور اعتبار بغیر کسی سبب کے نہیں ہے بلکہ اس کی واحد وجہ ناصر کی غزل کی سچائی ہے۔ وہ ایک سچا شاعر ہے، جس نے زندگی کی صداقتوں کو شعری صداقتیں بنا دیا۔ اس نے زندگی کے سفر میں جو کچھ دیکھا، جو محسوس کیا اسے باطن کا تجربہ بنا لیا اور یہ اس کے باطنی تخلیقی تجربے کا ہی معجزہ ہے کہ اس کی غزل زندگی سے ماورا محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اس دنیائے خوب وزشت کا باسی ہے جس میں ہم سب زندہ ہیں، فرق ہے تو سوچ اور احساس کے اسلوب کا...... جس کی شدت ناصر کو تخلیقی سطح پر زرخیز بنا دیتی ہے اور پھر ناصر تو زندہ ہی تخلیقی سطح پر تھا۔ اس کی زندگی اور شاعری میں کوئی فاصلہ نہیں تھا۔

> "اس کے یہاں گڑ بڑ یہی ہے کہ اس نے زندگی اور شاعری کو گڈمڈ کر رکھا ہے۔ وہ شعر کہتا ہی نہیں، جیتا بھی تھا"۔ (10)

اور دوسری طرف!

> "ناصر کاظمی غریب اپنی شاعری پر قابو نہ رکھ سکا' اس کی شاعری اس کی زندگی میں درانہ گھس آئی ہے"۔ (11)

زندگی اور شاعری میں ربط و تعلق کا یہ عالم ہو کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر بن جائیں تو دونوں کی سچائیوں پر یقین آ جاتا ہے۔ اس کی زندگی جن غموں اور دکھوں سے نباہ کرتے گزری' ان کا اظہار اس کی غزل میں جھلکتا ہے۔ اس کی غزل اداسی کے تجربے کی عکاس ہے تو ناصر زندگی میں واقعی اداس تھا، ہجرت اس کے لئے تخلیقی

تجربہ بنتی ہے تو ہجرت اس کے جسم و جاں پر وارد ہوئی ہے' اس کے ہاں اگر عشقیہ شاعری کے مضامین ملتے ہیں تو وہ عشق و محبت کے تجربوں کی بھٹی سے گزرا تھا' اس نے اگر پھیلتے ہوئے نظامِ زر کی قباحتوں کو محسوس کیا ہے اور اپنے تخلیقی تجربے کے ذریعے ان کو بیان کیا ہے تو اس کے اس تجربے اور اس کے بیان میں بھی سچائی نظر آتی ہے کہ وہ خود اس نظام زر کی قباحتوں کا شکار ہوا تھا' اس کی غزلوں میں اگر رنگ و موسم سے ہم کلامی ملتی ہے تو وہ اپنی زندگی میں بھی اس ہم کلامی کے تجربے سے گزرا تھا' یہ ہم کلامی غمِ عشق اور غمِ ہجرت کا مداوا تھی...... یا کچھ اور...... بہر حال اس میں بھی صداقت تھی۔ ناصر نے "رات" کو اور "یاد" کو اپنی شاعری کا استعارہ بنایا تو اس کی زندگی میں "رات" اور "یاد" کی واقعی ایک خاص معنویت تھی...... غرض یہ کہ اس کی غزل اس کی زندگی کی سچی ترجمان ہے۔ اس کی غزل میں بلا شبہ اس کے خالق کے بڑے سچے خدوخال تلاش کئے جاسکتے ہیں اور یوں اگر ناصر کو سچائیوں کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان سچائیوں میں ایک سچائی ایک غمِ عشق ہے جو ایک بہت بڑا تخلیقی محرک ہے۔

غمِ عشق

ناصر کاظمی نے محبتیں کیں اور ایک سے زیادہ کیں اور کم و بیش ہر ایک میں ناکام رہا' لیکن اس ناکامی کے باوجود اس کے تجربے کی صداقت پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تجربہ ایک ایسے عاشق کا تجربہ ہے جس کو وصال کے لمحے میسر تو ضرور آئے ہیں لیکن ان کا معاملہ بھی عارضی لذتوں کا سا ہے...... اصل شے تو ہجر و فراق کے وہ طویل سلسلے ہیں جو ناصر کی غزل پر چھائے ہوئے ہیں۔ ناصر نے کسی تخیلی وجود کو نہیں چاہا بلکہ اس کا محبوب گوشت پوست سے بنا انسان ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ناصر کی غزل سے

عاشق کا پیکر تو ہوتا ہے، محبوب کے خدوخال وضع نہیں کیے جاسکتے۔ ان اشعار میں محبوب کا ایک تصور ضرور موجود ہے لیکن کوئی ایسا پیکر نہیں ابھرتا جسے کوئی نام دیا جاسکے یا جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ اس کا "رنگ روپ" اس نوعیت کا ہے...... مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیے۔

اس پیکرِ ناز کا فسانہ　　دل ہوش میں آئے تو سنائے
آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر　　عارض کہ شراب تھر تھرائے
اڑتی ہوئی زلف یوں پریشاں　　جیسے کوئی راہ بھول جائے

رنگ کھلے صحرا کی دھوپ　　زلف گھنے جنگل کی رات

وہ ستارا تھی کہ شبنم تھی کہ پھول　　ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
کیسی ویراں ہے گزر گاہِ خیال!　　جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

طاقِ میخانہ میں چاہی تھی اماں　　وہ بھی تیرا خمِ ابرو نکلا

ٹھہرا تھا وہ گل عذار کچھ دیر　　بھرپور رہی بہار کچھ دیر

اولیں چاند نے کیا بات سجھائی مجھ کو　　یاد آئی تری انگشت حنائی مجھ کو

میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

جہاں بھی تھا کوئی فتنہ تڑپ کے جاگ اٹھا
تمام ہوش تھی مستی میں تیری انگڑائی

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
بلا رہی ہے ابھی تک وہ دل نشیں آواز

ترا خیال بھی تیری طرح مکمل ہے
وہی شباب، وہی دل کشی، وہی انداز

شراب و شعر کی دنیا بدل گئی لیکن
وہ آنکھ ڈھونڈ ہی لیتی ہے بے خودی کا جواز

تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی
آنکھ کہتی ہے ترے دل میں طلب ہے کوئی

آنچ آتی ہے ترے جسم کی عریانی سے
پیرہن ہے کہ سلگتی ہوئی شب ہے کوئی

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

جب سے دیکھا ہے ترے ہات کا چاند
میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند

رس کے معنی جسے نہیں معلوم
ہم نے اس رس بھری کو چوم لیا

ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے
جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے

وہ سیدھی سادی ادائیں کہ بجلیاں برسیں
وہ دلبرانہ مروت کہ عاشقانہ لگے

(برگِ نَے)

اک سے ترا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانوں پر
اک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل!
یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل!

ایک دم اس کے ہونٹ چوم لئے' یہ مجھے بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی
ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا' جانے کیا بات درمیاں آئی

کہیں ملا تو کسی دن منا ہی لیں گے اسے وہ زود رنج سہی' پھر بھی یار اپنا ہے

دل دکھاتا ہے وہ مل کر بھی مگر آج کی رات اسی بے درد کو لے آؤ کہ کچھ رات کٹے

......(دیوان)

ان اشعار سے جو ایک شخصی خاکہ مرتب ہوتا ہے' اس میں ایک "پیکر ناز" ہے، "دو آنکھیں چھلکتے ساغر ہیں"، "عارض"؛ "زلف پریشاں"، ہے "رنگ کھلے صحرا کی دھوپ کا سا ہے" "خم ابرو" بھی ہے، "انگشتِ حنائی" بھی ہے...... "انگڑائی"، "شباب"، "جسم کی عریانی کی آنچ"، "نظر کے جادو"، "ہات کا چاند"، "رس بھری"، "پھول سا نازک ہاتھ"، "کاجل" اور "ہونٹ" ہیں......ان اشاروں سے کسی محبوب کا خاکہ بنتا تو ضرور ہے لیکن مکمل نہیں، اور پھر یہ لوازمات کسی بھی محبوب کے ہو سکتے ہیں، ناصر کے خاص مرکزِ نگاہ کے نہیں...... اس عمومیت کو دیکھ کر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ناصر عشق کا شاعر تو ضرور ہے حسن کا نہیں' وہ حسن پسند، مگر محبوب پرست ہے، اسے

محبوب کی شخصیت سے دلچسپی ہے، اس کے حسن و جمال کے لخت لخت مطالعے سے نہیں......ناصر کے مقابلے میں حسرت حسن کا شاعر ہے، حسرت کے ہاں بھی عاشق کا تصور واضح طور پر موجود ہے لیکن اس کے محبوب کا ایک پیکر ابھر کر سامنے آتا ہے جو تپتی دوپہروں میں کوٹھے پر ننگے پاؤں آتا ہے اور جو منہ میں دوپٹے کا کونا دبائے ہوئے ہے، اس کے مقابلے میں ادھر ناصر کا عاشق ہے جو تپتی دوپہروں میں ہراساں اور اداس پھرتا ہے۔

میں کیوں نہ پھروں تپتی دوپہروں میں ہراساں
پھرتی ہیں تصور میں کھلے سر تری یادیں

عشق کے تجربے کی یکسانیت سے کبھی کبھار ناصر کے ہاں ایک طرح کی بے کیفی اور گھبراہٹ بھی نظر آتی ہے ایسے لمحات میں وہ ہجوم نگاراں میں نئے چہروں اور نئے تجربوں کا متلاشی نظر آتا ہے۔ناصر کا یہ انداز عشق و محبت کی بدلتی ہوئی نفسیات کا آئینہ دار ہے جو اردو شاعری کے روایتی تصورِ محبت سے مختلف ہے۔

یہ کیا کہ ایک طَور سے گزرے تمام عمر!
جی چاہتا ہے کہ اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
ٹوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طلسم!
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو!

اور......

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

لیکن یہ تو اس قسم کا معاملہ ہے کہ انسان سر چڑھ کر بات کر رہا ہو ، حقیقت

سے فرار کی ایک رومانوی سی کوشش...... "نئے چہرے" اور "نئے غم" کی آرزو اتنی آسان نہیں...... تبھی تو ناصر خود ہی اعتراف کر لیتا ہے......

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی!

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے

اور......

ہر چند ترا عہدِ وفا بھول گئے ہم — وہ کشمکشِ صبر طلب یاد رہے گی
سینے میں امنگوں کا وہی شور ہے اب تک — وہ شوخیِٔ یک جنبشِ لب یاد رہے گی

یاد آتا ہے روز و شب کوئی — ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

دراصل معاملہ یہ ہے کہ عشق ناصر کے اندر ہے، جو کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتا ہے اور وہ اظہار کے لئے خارجی سہارے ڈھونڈھتا ہے۔ یوں محبوب کا تصور اس کے عشق کے اظہار کا ایک خارجی وسیلہ ہے جس کو ناصر نے اپنے عشق کے تجربے کا اساسی کردار بنا لیا ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ عشق کا تجربہ ناصر کے لئے ذاتی نوعیت کا نہ ہو۔ اس نے چاہا مگر چاہے جانے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اس طرح ناصر حسن سے زیادہ عشق اور عشق سے زیادہ غمِ عشق کا شاعر ہے۔ وہ ایک ایسی محرومی کا نوحہ خواں ہے جس کے سلسلے ناکامیوں سے مربوط ہیں۔ اداسی اور افسردگی کا وہ گہرا احساس جو ناصر کی شاعری پر گہرے

کی طرح چھایا ہوا ہے۔اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں وہاں یہ غمِ عشق کا عطیہ بھی ہے۔ آرزو کی آسودگی، غمِ دنیا کے سیلاب میں بھی انسان کو اداس نہیں ہونے دیتی...... لیکن ناصر تو اداس ہے، افسردہ ہے اور تنہا ہے۔ ناصر کی اداسی اور افسردگی خود ساختہ اور مصنوعی نہیں...... بلکہ تجربے کی صداقتوں سے پھوٹی ہے۔کیا یہ اشعار ان صداقتوں کے غماز نہیں......؟ غمِ عشق کے تجربے کے غماز......

محرومِ خواب دیدۂ حیراں نہ تھا کبھی　　تیرا یہ رنگ اے شبِ ہجراں نہ تھا کبھی
پرساں نہ تھا کوئی تو یہ رسوائیاں نہ تھیں　　ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی
دن بھی اداس اور مری رات بھی اداس　　ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

ترے ملنے کو بے کل ہو گئے ہیں　　مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں
بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم　　وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں
جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر　　وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔

......(برگِ نَے)

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا　　جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
یاد کے بے نشاں جزیروں سے　　تیری آواز آ رہی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں　　زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

......(دیوان)

غمِ ہجرت

غمِ عشق کے بعد جو دوسرا بڑا تجربہ ناصر کی شخصیت اور شاعری پر وارد ہوا

وہ ''ہجرت'' کا تجربہ ہے۔ ہجرت کا یہ تجربہ افسانوی ادب میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے ہاں دکھائی دیتا ہے' جب کہ شاعری میں اس کا سب سے بڑا اور بامعنی اظہار ناصر کاظمی کی غزل میں جھلکتا ہے۔ ناصر کے ہاں ہجرت دو سمتوں سے وارد ہوئی ہے' ایک رشتوں کے انقطاع کی جہت سے اور دوسری فسادات کے نتیجے میں قدروں کی پامالی کے راستے سے...... ناصر کے ہاں قرۃ العین حیدر کا سا معاملہ تو نہیں کہ ہجرت کے بعد مراجعت کا سفر بھی ناگزیر بن کر رہ جائے لیکن تقسیم اور ہجرت جس طرح رشتوں اور رابطوں کی زنجیر کی شکستگی کا باعث بنی ہے، اس نے ناصر کو حد درجہ اداس کیا ہے۔ اسے اپنے وطن کی بے طرح یاد آئی ہے اور رہ رہ کر بچھڑے دیاروں کا خیال آیا ہے۔ رہا فسادات کا مسئلہ تو وہ بھی ناصر کے لئے کم تکلیف دہ ثابت نہیں ہوا۔ قدروں کی پامالی کا نوحہ فسادات کے بطن ہی سے پھوٹتا ہے اور بلا شبہ یہی نوحہ ناصر کی غزل کی اولین شناخت ہے۔ ناصر کی شخصیت اور شاعری کو ہجرت کے حوالے کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

''......ایک خلقت تھی کہ رنج ہجرت کھینچ رہی تھی اور کتنے خانہ برباد تھے کہ یادوں کے بجھے ہوئے سویرے آنکھوں میں چھپائے پھرتے تھے۔ ناصر کا زندگی کرنے کا طور اور شعری رویہ دونوں کی معنویت اسی سیاق و سباق میں کھلتی ہے''۔(12)

ناصر کے لئے تقسیم تو المیہ نہ بنی لیکن ہجرت اور فسادات المیہ ضرور بنے جنہوں نے ناصر کی غزل کو ایک بہت بڑی اساسی معنویت دی ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ۔

''ہجرت کے معنی صرف ایک سر زمین کو چھوڑنا نہیں

تھا، یہ صدیوں کے انسانی رشتوں کو چھوڑنے اور ایک
بالکل نئی صورتِ حال میں از سر نو زندگی شروع کرنے کا
مسئلہ تھا"۔(13)

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہجرت کا یہ تجربہ جو ناصر کے لئے ایک عمومی سے انسانی تجربے سے کہیں زیادہ ایک شاعر کے تخلیقی تجربے کی طرح ہے...... کس کس وسیلے سے اظہار کے راستے تلاش کرتا ہے؟ غور کریں تو ناصر کی غزل میں "سفر" ایک بڑے استعارے کے طور پر موجود ہے جو یقیناً ہجرت کے تجربے کی دین ہے۔ یہ استعارہ حال کے جاں گداز مرحلوں کا امانت دار ہی نہیں، ایک حسین اور خوشگوار ماضی سے بھی مربوط ہے۔

"ناصر کاظمی کی غزل میں اس تجربے کے راستے تصویروں
کے ایک ایسے سلسلے نے راہ پائی کہ غزل کی امیجری ہی
بدل گئی' شہر اور بستی کے لفظ گم شدہ تہذیبی سانچوں
کی یاد بن کر بار بار استعمال ہوئے مگر شاید اس سے بھی زیادہ
با معنی لفظ "سفر" جو تقسیم سے پہلے کی غزل میں کم نظر
آئے گا' ناصر کی غزل میں ایک نمائندہ استعارہ بن گیا۔ سفر
کا یہ استعارہ حاضر کے تجربے کے ساتھ ساتھ ماضی کے
تجربوں سے گونجتا ہوا معلوم ہوتا ہے"۔(14)

اس سفر میں قافلے ہیں، قافلوں کی گھنٹیاں ہیں......ان قافلوں میں ہجرت کے دکھوں کا درد چھپا ہوا ہے......ناصر نے یہ دکھ سہے اور ان کو اپنے تخلیقی تجربوں کا حصہ بنا کر ان کو بیان کیا تب ہمیں محسوس ہوا کہ ہم بھی ناصر کے ساتھ انہی رنجور اور زخم خوردہ

قافلوں کے مسافر ہیں۔ یہ قافلے اور کارواں بھی ہجرت کی ایک علامت سے زیادہ ایک ایسی تلاش کا استعارہ بنتے نظر آتے ہیں جس کا مقصود ایک روشن منزل تھی۔ اس منزل کی جستجو تو سچی ہے مگر اس سفر میں موہوم اندیشے اور انجانے خوف بھی ہیں کہ راستے سے بھٹک نہ جائیں۔ ساتھ ساتھ تباہی اور بربادی کے خرابے بھی ہیں جو منزل کی اس جستجو میں قافلوں کے راستوں میں آتے ہیں۔ سفر کی روداد ناصر کے ہاں اشکوں سے عبارت ہے۔ اس میں ست گام کارواں اور خاموش اور متذبذب راہبر بھی نظر آتے ہیں' ٹوٹے پھوٹے بام و در بھی آتے ہیں۔ شاخوں کے جلے ہوئے بسیرے بھی اور بچھڑنے والوں کی یاد بھی۔

دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کے شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو قافلوں نے رستے میں جما لئے ہیں ڈیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے
......(برگِ نے)

کارواں ست راہبر خاموش کیسے گزرے گا یہ سفر خاموش
ابھی وہ قافلے نہیں آئے ابھی بیٹھیں نہ ہم سفر خاموش

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در

یہ وہی دیار ہے دوستو! جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر نگر نگر!

کہاں کھو گیا مرا قافلہ، کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

......(دیوان)

ہجرت کا تجربہ ناصر کی غزلوں (برگِ نے) کا ایک بڑا محرک ہے لیکن غور کریں تو اس کا احساس "دیوان" میں بھی جھلکتا ہے اور "سفر" کا وہ استعارہ جو ہجرت کے تجربے سے پھوٹا تھا، وہ ناصر کے سارے شعری سفر میں ایک باطنی احساس کے طور پر موجود ہے۔ حتیٰ کہ "پہلی بارش" جو ناصر کے آخری دور کی شاعری ہے اس میں بھی ایک سفر کی روداد ہے۔ اور ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ ناصر کا تجربہ ذاتی تجربے سے بڑھ کر اجتماعی تجربے کی آواز بن جاتا ہے۔ ناصر کاظمی نے "برگ نے" کے دیباچے میں لکھا تھا۔

"آج کا شاعر......ایک نئی آواز پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس کے اپنے گرد و پیش اور اس کے اپنے آسمان اور زمین سے بھی علاقہ رکھتی ہو......دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بھی بن سکتی ہے یا نہیں"۔(15)

......یوں غور کریں تو 1947 سے 1949ء تک ناصر کی غزلوں میں ہجرت کے اجتماعی تجربے، بے نشان، بے منزل قافلوں کے سفر اور عام تباہی اور ویرانی کی حد درجہ موثر جھلکیاں ملتی ہیں جہاں ناصر کی آواز بلا شبہ اپنے گرد و پیش، اپنے زمین و آسمان اور ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی آواز بن گئی ہے۔

او مرے مصروف خدا اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے شہروں میں ہے سناٹا
خاک اڑاتے ہیں دن رات میلوں پھیل گئے صحرا!
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں نگری نگری کال پڑا

نہ جانے کہاں لے گئے قافلے مسافر بڑی دور جا کر رے
جہاں کوئی بستی نظر آگئی وہیں رک گئے اجنبی قافلے

شہر در شہر گھر جلائے گئے یوں بھی جشن طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب اک طرف جشنِ جم منائے گئے
کیا کہوں، کس طرح سربازار عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے

کسے دیکھیں کہاں، دیکھا نہ جائے وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جا
زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے
سفر ہے اور غربت کا سفر ہے غمِ صد کارواں دیکھا نہ جائے

ہجرت کا یہ تجربہ مقام اور وقت دونوں حوالوں سے تھا، دونوں سے دوری اور اجنبیت کے احساس نے ناصر کے ہاں اگلے وقتوں کی یاد، پرانی صحبتوں کا خیال اور جاں سے عزیز رشتوں سے ٹوٹ جانے کے احساس کو جنم دیا۔یہی وہ موڑ ہے جہاں ناصر کو حسن ماضی نے بے چین کیا ہے اور یہی وہ رخ ہے جس نے ناصر کو ہجرت کے بعد کی

زندگی میں اجنبی بنا کر رکھ دیا۔ وہ لوگوں میں موجود تو ہے، کہیں مربوط نہیں ہے وہ زندگی کے ساتھ اپنے ربط ڈھونڈتا بھی ہے مگر وہ نہیں ملتے...... یوں ناصر اس اجنبی کی طرح جینے پر مجبور ہے جس کو اپنے ماضی سے کٹ جانے کا شدید غم لاحق ہے۔ وہ اکیلے پن کا اسیر ہے، ہجوم میں تنہا ہے اور نئی زندگی کے ساتھ اس کو مطابقت کا مسئلہ در پیش ہے۔
یوں اس کی اداسیوں کے سامان پیدا ہوتے گئے اور وہ مقام اور وقت کی دہلیز پر کھڑا مقام و وقت کے کچھ اور جزیروں کے خواب دیکھتا رہا۔ ان جزیروں کے خواب جو ہجرت کے اُس پار رہ گئے تھے......

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ　　لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
اب کی فصلِ بہار سے پہلے!　　رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہیں اب تمہیں خزاں والو　　جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں　　یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں　　چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

آج غربت میں بہت یاد آیا　　اے وطن تیرا صنم خانۂ گُل

چمن در چمن وہ رمق اب کہاں　　وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں
کراں تا کراں ظلمتیں چھا گئیں　　وہ جلوے طبق در طبق اب کہاں
بجھی آتشِ گُل، اندھیرا ہوا　　وہ اجلے سنہرے ورق اب کہاں

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں　　اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے
اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ　　کیا خبر کون کہاں تھا پہلے!

غمِ عشق اور غمِ ہجرت کا مداوا۔ فطرت سے ہم کلامی

غمِ عشق اور غمِ ہجرت کے مداوے کی ایک صورت ناصر کی فطرت پسندی ہے۔ وہ فطرت پرست نہیں ہے مگر فطرت کے ساتھ ہم کلام ہو کر اپنے جی کا بوجھ ضرور ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ اسے پیڑوں، درختوں، شاخوں، پھولوں، جگنوؤں، چڑھتے سورج، ڈوبتے دن، صبح، شام، طائرِ نغمہ سرا، آبِ صفا، چاند، برسات، بہار، چمن اور اس قسم کے دوسرے مظاہر اور مناظرِ فطرت سے گفتگو کرنے میں لطف محسوس ہوتا ہے......اس کی فطرت پسندی کی ایک واضح وجہ یہی دکھائی دیتی ہے کہ ہجرت کی ایک معنوی جہت فطرت سے دوری بھی ہے۔ ہجرت کے بعد ناصر کو جو زندگی ملی وہ ایسے شہر کی زندگی تھی جس میں اس کے کبوتروں کے لئے گنجائش نہیں تھی جب کہ کبوتر ناصر کو حد درجہ عزیز تھے۔ یوں فطرت کے قریب ہو کر ناصر اپنے غموں کو آسودہ کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ ان مناظر اور مظاہر کے وسیلے سے نئی زندگی کے ساتھ ربط پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ فطرت کے نواہائے راز کی محرمی ناصر کا دل پسند مشغلہ ہے۔

سازِ ہستی کی صدا غور سے سن　　کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن
دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان　　شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن
چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان　　ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام　　روح کے تار ہلا غور سے سن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سن

برگِ آوارہ بھی اِک مطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سن

رنگ منت کشِ آواز نہیں
گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن

خامشی حاصلِ موسیقی ہے!
نغمہ ہے نغمہ نما، غور سے سن

آئینہ دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمۂ آبِ صفا غور سے سن

چلے تو ہیں جرسِ گُل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

چلو کہ برف پگھلنے کی صبح آ پہنچی
خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارا

چلے چلو انہی گمنام برف زاروں میں
عجب نہیں یہیں مل جائے درد کا چارا

یہ اشعار اور اس طرح کے دیگر اشعار کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناصر کی فطرت پسندی، مظاہرِ فطرت سے ہم کلامی اور موسموں کے تذکرے میں ایک پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں کو اپنے اندر کے موسموں کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور اپنے اردگرد کے مناظر کو اپنی داخلی واردات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ درخت، پھول، رنگ، موسم، بارش، پتے، دریا، پانی...... سب کچھ ناصر کے لئے اہمیت رکھتا ہے مگر کسی خارجی حوالے سے نہیں بلکہ داخلی حوالے سے...... گویا ان چیزوں کی معنویت ناصر کے ہاں ذاتی نوعیت کی ہے...... وہ درختوں، پھولوں، رنگوں، موسموں، بارشوں، پتوں اور اسی طرح کے دیگر مظاہر کی طرف اس لئے متوجہ ہوتے ہیں کہ ان سب سے کوئی نہ

کوئی یاد منسوب ہے یا کوئی ذاتی حوالہ موجود ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے کہ پیڑ ناصر کے لیے کیوں اہم ہے۔

ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے
اب اس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں

ذیل کے اشعار میں بھی داخلی حوالے موجود ہیں۔

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اُگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت

پہلی بارش ، میں اور تو زرد پہاڑوں کا دامن
لال کھجوروں نے پہنے زرد بگولوں کے کنگن

معروضی طور پر دیکھیں تو ناصر کے ہاں فطرت، موسموں اور مظاہر فطرت کے بیان میں خارجی شعور کا فقدان نظر آتا ہے جس سے ان اشعار کی اہمیت ذاتی ہو جاتی ہے اور ان میں اجتماعیت کا رنگ پیدا نہیں ہونے پاتا لیکن یہ ناصر کا اپنا انداز ہے کہ وہ خارج کو داخلی حوالوں سے دیکھتا ہے اس کے اندر کے موسم اس کے لئے بے حد اہمیت رکھتے ہیں اور وہ ہر شے کو اس تناظر میں دیکھتا ہے اور اس میں اس کو سکون اور عافیت محسوس ہوتی ہے۔

میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی

ناصر کی اداسیوں کا ایک بڑا سبب وہ نظام زر بھی ہے جو ہمارے ہاں ہجرت کے

بعد پیدا ہوا اور جس نے انسان کو بدل کر رکھ دیا۔ اس تناظر میں اس انسان کی تلاش ناصر کی غزل میں جابجا نظر آتی ہے جو ہجرت کے بعد کی نئی زندگی میں گم ہو گیا' وہ انسان جس کے پاس دل تھا' جذبہ و احساس کی فراواں دولت تھی' اس کے پاس دوسرے کی باتیں سننے کے لئے وقت تھا، وہ اس قدر مصروف نہیں تھا کہ وہ صبح سویرے گھر سے نکلے اور رات گئے اس وقت گھر لوٹے جب سب سو چکے ہوں وہ چپکے سے آئے اور سو جائے اور پھر اگلی صبح مقررہ وقت سے رات کے مقررہ وقت تک وہی معمولات دہرا دے...... ہجرت کے بعد نئی زندگی کا یہ المیہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب روپے پیسے کے حصول اور مادے کے عمل دخل نے ایک ایسے نظامِ زر کو جنم دیا جو مادی نقطۂ نظر سے ذاتی اور قومی سطح پر تو شاید سود مند ہو لیکن یہ سود مندی انسانی نقطۂ نگاہ سے بڑی مہلک ثابت ہوئی۔ مشینوں کی حکومت نے احساسِ مروت کو کچل کر رکھ دیا بلکہ انسان کو بھی مشین بنا دیا۔

> "مشین نے ہمارے تہذیبی ڈھانچے کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ سہل پسندی' ہوس پرستی اور جذبۂ تعیش کی کارفرمائی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ آج ہماری پہچان اور قدر و قیمت تازہ ترین ماڈل کی کار' ریفریجریٹر' ایئر کنڈیشنر' بیش قیمت قالین اور دیگر سامانِ تعیش سے متعین ہوتی ہے۔ ہم خود کار مشینوں کے عائد کردہ معاشرتی نظام کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں...... حد تو یہ ہے کہ ہماری جنسی زندگی بھی میکانکی ہو کر رہ گئی ہے...... ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی میں رومانویت' آزاد روی' طمانیتِ قلب' اخلاق و مروت اور شرافت و نجابت کے جتنے بھی پہلو تھے' صنعتی تہذیب نے ہمیں ان سے

بیگانہ ہی نہیں متنفر بھی کر دیا ہے۔" (16)

یہی بیگانگی اور تنفّر ناصر کے لئے تکلیف دہ ہے اور وہ صنعتی تہذیب اور نظامِ زر سے بیزار اسی لئے ہے کہ اس نے انسان کو انسان سے زیادہ مشین بنا دیا ہے جو ایک نظام کے تابع ہو کر اپنی سماجی اور تہذیبی ذمے داریوں کو بھی فراموش کر بیٹھا ہے۔ یہ بات ناصر کے لئے بڑی اذیت ناک ہے کہ ایک مشترکہ دیوار رکھنے والے ہمسائے اور پڑوسی بھی اک دوسرے کے دکھ درد سے نہ واقف ہیں اور نہ شریک...... نفسا نفسی اور اغراض کی دوڑ نے جہاں ناصر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا وہاں اسے حد درجہ تنہا بھی کر دیا۔

"وہ چین سے سوتی ہوئی بستیوں کے درمیان مارا مارا پھرتا ہے اور اسے کوئی ہم سفر نہیں ملتا۔ اس کے دیار کی سوئی ہوئی زمین ان لوگوں سے خالی ہو گئی ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ بازار بند ہیں، راتیں سنسان اور بے چراغ ہیں۔ تنہا راتوں کا مسافر، اداس شاعر دیکھتا ہے کہ کوئی گھر سے نہیں نکلتا۔ اس عالم میں اگر کوئی ملتا بھی ہے تو دل کی بات کرنے یا سننے کے قابل نہیں ہوتا، کیونکہ اب دلوں میں آگ باقی نہیں رہی' کوئی چیز ہے جو کھو گئی ہے" (17)

ناصر کے سامنے اس کے اس تجربے کی معنویت اس وقت کھلتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ نظامِ زر نے انسان اور فطرت کے رشتے لور تعلق کو ناممکن بنا دیا ہے۔ صنعتی تہذیب اور نظامِ زر نے انسان کو بے حس لور سفاک بنا دیا ہے۔ انسان اندر سے بھی بدل رہا ہے لوباہر سے بھی......انسانی رشتے ٹوٹ رہے ہیں کامیابی کی تلاش شعارِ عام بن رہی ہے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ تجوریاں تو بھر رہی ہیں لیکن دل خالی ہو رہے ہیں' شہروں میں اجنبی زیادہ

ہو رہے ہیں اور شناسا چہرے گم ہونے لگے ہیں اور محفلیں ویران روحوں کا اجتماع اور انبوہ بنتی جا رہی ہیں...... یہی لگتا ہے کہ ماؤں نے انسان پیدا کرنے کی بجائے تاجر جنم دینا شروع کر دیئے ہیں۔ غرض یہ کہ اقدار کی دنیا مقدار میں تبدیل ہو رہی ہے اور وہ قدریں جو انسانی تہذیب کی اساس ہیں بڑی تیزی سے مٹ رہی ہیں...... یہ صورتِ حال ناصر جیسے تخلیقی انسان کے لئے حد درجہ اداس کر دینے والی ہے، وہ خود کہتا ہے۔

> "ہم لکھنے والے مسافر ہیں، نا معلوم منزلوں کے، مگر ہر مسافر کی الگ الگ منزل ہے ہم سب تھوڑی دور ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں اور پگ ڈنڈی پر بچھڑ جاتے ہیں اور اکیلے رہ جاتے ہیں اور اداسی ہماری ہم سفر رہ جاتی ہے۔ یہ اداسی کوئی ذاتی اداسی نہیں......بلکہ تخلیقی لوگوں کی مشترکہ قدر ہے"۔(18)

وہ تاجروں سے بھری اس معاشرت میں انہی قدروں کی حکومت چاہتا ہے جن کو صنعتی نظام کی بے حسی نے نگل لیا ہے۔

> "ناصر کاظمی کی شاعری پھیلتے ہوئے شہر کی اجاڑ سنسان راہوں، بکھرتے ہوئے قدری رویوں، بد ہیئت معاشرے کی کامیابیوں، شہر کے بے معنی ہنگاموں اور بکھرتے ٹوٹتے انسانی رابطوں میں معنویت کی تلاش تھی۔ فطرت، حسن اور شاعری کے تخلیقی رویے اس کی زندگی کا محور تھے۔ شہر کے بے معنی ہنگاموں میں اونگھتے رہنا اور رات بھر جاگنا اس کا شعار تھا۔ اور یہی گرد و پیش کی لامعنویت کو

اس کا تخلیقی جواب تھا"۔(19)

......یوں صنعتی تہذیب اور نظامِ زر کے طویل سلسلوں میں ناصر کاظمی اس "انسان" کی تلاش میں سرگرداں ہے جو اُس کی بے حسی کی بھینٹ چڑھ گیا اور جو زر پرست معاشرے کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا......وہ انسان ناصر کو بہت عزیز تھا جسے "تاجروں کی بستی" نے اس سے چھین لیا......اس انسان کی تلاش کا سفر دن کو بھی ہے اور رات کو بھی......ناصر اپنی اداسی، رت جگے اور تنہائی کا زادِ راہ لے کر اس تلاش میں سرگرم دکھائی دیتا ہے۔

کن بے دلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کے نور، نہ باتوں میں تازگی
بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں!
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی
وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا!
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی
میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی
بازار بند راستے سنسان بے چراغ!
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی
اے روشنیٔ دیدہ و دل اب نظر بھی آ
دنیا ترے فراق میں اندھیر ہو گئی!

کس سے کہوں، کوئی نہیں، سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میتِ شہر بے کفن

اب ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ناصر
وہ ہم نوا جو مرے رت جگوں میں شامل تھے

بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے
یہ ہم سفر مرے کتنے گریز پا نکلے

خدا جانے ہم کس خرابے میں آ کر بسے ہیں
جہاں عرضِ اہلِ ہنر نکہتِ رایگاں ہے

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

کر دیا آج زمانے نے انھیں بھی مجبور
کبھی یہ لوگ مرے دکھ کی دوا کرتے تھے

جنھیں زندگی کا شعور تھا، انھیں بے زری نے بچھا دیا
جو گراں تھے سینۂ خاک پر، وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

پکارتی ہیں فرصتیں' کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انہیں' کہ آسمان کھا گیا

......(دیوان)

ناصر کے ہاں اداسی اور تنہائی بعض اوقات ایک پناہ گاہ کے طور پر بھی نظر آتی ہے جس میں وہ عافیت محسوس کرتا ہے کہ زر پرست معاشرے کے دکھوں سے کچھ دیر کے لئے نجات حاصل کر سکے۔

"زر پرستی کے پیچھے بھاگنے والے معاشرے میں اداسی اور تنہائی معاشرے کے گھناؤنے ماحول سے پناہ دیتے ہیں......یہ اداسی کوئی ذاتی اداسی نہیں بلکہ تخلیقی لوگوں کی مشترکہ تقدیر ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ اب تک بہت سے شاعری کا دعوی کرنے والے لوگوں کو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جعلی الاٹمنٹوں اور راتوں رات امیر بن جانے کے نسخے ڈھونڈنے والے معاشرے میں ناصر اداس کیوں تھا؟" (20)

یادیں ہی یادیں

ناصر کے ہاں یادیں بڑا گہرا تاثر رکھتی ہیں' اداس بھی کرتی ہیں اور اداسیوں کا مداوا بھی......ان یادوں کا تعلق ماضی سے ہے جو ناصر کو ہمیشہ عزیز رہا۔ ان یادوں میں صرف محبت کی یاد ہی نہیں' ایک لٹی ہوئی مٹتی ہوئی تہذیب کی یاد بھی ہے۔ ان رشتوں کی یاد بھی ہے جو ناصر کے لئے ذہنی اور جذباتی سہارا تھے اور جو ہجرت کے باعث ٹوٹ گئے

تھے...... پھر یہ یادیں ناصر کو عزیز کیوں نہ ہوتیں...... انہیں "رفتگاں" کی یاد بے چین کیوں نہ کرتی۔ فراق گورکھپوری نے کہا تھا:

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

لیکن ناصر میں ہمت ہے کہ وہ گئے ماہ و سال کی گرد سے ان یادوں کو آواز دے سکے جو اس کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ ناصر کو غمِ عشق اور غمِ ہجرت نے اداس کیا' اسے اس انسان کی محرومی نے پریشان کیا جو اس کا مونس تھا اور جسے نظامِ زر نے اس سے چھین لیا تھا...... دراصل غمِ عشق غمِ ہجرت اور مونس و ہمدرد انسانوں سے محرومی سے وابستہ کچھ یادیں ہیں جو اسے اداس کر دیتی ہیں۔ اس کا حال اس سرمائے سے خالی ہے جس سے اس کا ماضی مالا مال تھا...... پھر ان یادوں نے اسے اداس کیا تو یہ ایک فطری سا عمل ہے' لیکن یہ یاد اس کی اداسیوں کا مداوا بھی بنی ہے۔ حال جب اس کے لئے عذاب جاں بن گیا' وہ بھرے شہر میں تنہا رہ گیا اور اس کے رت جگوں کے ساتھی ایک ایک کر کے بچھڑ گئے...... تو اس کا وہ ماضی جو ان یادوں کا سرچشمہ تھا'اس کے لئے راحتِ جان بن کر آگیا' گئے دنوں کی یادیں اس کی دست گیر بن گئیں...... یہی وہ موقع ہے جب یہ یادیں ناصر کے لئے ایک تخلیقی محرک بن جاتی ہیں۔ یاد ماضی ناصر کے لئے محض عذاب ہوتی یا اس کا حافظہ چھن جاتا تو یہ بات ناصر کے لئے قطعاً مفید نہ ہوتی۔

"یاد اسے ماحول کی چپ اور دل کی ویرانی سے نجات دلاتی ہے۔ یاد ہی اس کے تخیل کو متحرک کر کے اسے تخلیقی سطح پر مشتعل کر دیتی ہے۔ اگر یاد کی قوت ناصر کا ساتھ نہ دیتی تو اس کا تن ہی نہیں، من بھی کسی

خستہ حال مشین کی طرح ہکلانے لگتا اور وہ شعر کہنے کی

سکت ہی سے محروم ہو جاتا"۔ (21)

یوں ناصر کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری میں بھی یادیں موجِ خون کی طرح رواں دواں ہیں۔ ان یادوں میں بچھڑے ہوؤں کے تذکرے، گزرے دنوں کی باتیں، دیارِ ماضی کے افسانے، ماضی کے خوبصورت خوابوں کے احوال، پرانی محبتوں کی کہانیاں، رفتگاں کی جستجو اور گم شدہ ارمانوں کی حکایات جھلکتی ہیں۔ یہ ناسٹلجیا کا ایک ایسا تجربہ ہے جسے ناصر نے اپنی تخلیقی شخصیت کا حصہ بنا کر اور اپنے اندر جذب کر کے بیان کیا ہے جس سے وہ بے حد دلآویز ہو گیا ہے۔ یہ بیان کچھ اس وجہ سے بھی دلآویز نظر آتا ہے کہ ناصر نے اس کو محض روایت اور فیشن کے طور پر نہیں لیا، بلکہ اپنے تجربے کے وسیلے سے بیان کیا ہے اس وجہ سے اس میں واقعیت اور صداقت پیدا ہو گئی ہے۔

صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری　　نگاہِ شوق کس منزل سے گزری

ہر نفس شوق بھی ہے منزل کا　　ہر قدم یادِ رفتگاں بھی ہے

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ　　اور کچھ دن پھرو اداس اداس

عالمِ خواب میں دکھائے گئے　　کب کے ساتھی کہاں ملائے گئے

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا وہ تری یاد تھی اب یاد آیا

آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست تو مصیبت میں عجب یاد آیا

تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا! مر رہیں گے اگر اب یاد آیا

پھر کئی لوگ نظر سے گزرے پھر کوئی شہرِ طرب یاد آیا

بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

دلِ فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اٹھا یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہرِ رعنائی

پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر بچھڑ کے جس سے ہوئی' شہر شہر رسوائی

"یادوں" کی ایک جہت یہ بھی ہے۔

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اولیں قربَ کی سرشاری میں کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

......(برگِ نَے)

چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تری یادیں

تو جیسے مرے پاس ہے اور محوِ سخن ہے محفل سی جما دیتی ہیں اکثر تری یادیں

میں کیوں نہ پھروں تپتی دوپہروں میں ہراساں — پھرتی ہیں تصور میں کھلے سر تیری یادیں
جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سر شام — برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں
......(دیوان)

وہ رات کا بے نوا مسافر

"یادوں" کی طرح 'رات" بھی ناصر کے ہاں ایک بڑے استعارے کا درجہ رکھتی ہے۔ رت جگے ناصر کو ساری عمر عزیز رہے۔ اس کے ہاں رات کی ایک اپنی معنویت ہے جو تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

"ناصر کی دلی آرزو تو یہ تھی کہ دنوں کو سو کر اور راتوں کو جاگ کر زندگی گزارے۔ اس کے لئے دن ہنگاموں اور بے معنی مصروفیت کی چیز تھا اور رات زندگی کی معنویت اور تخلیق کا منبع......راتوں کو دوستوں کی محفل میں لچھے دار گفتگو کرنا اور سڑکوں پر ٹہلنا، اس کا دلچسپ مشغلہ تھا......اس کی پوری زندگی کے سفر کا حاصل ہجر کی راتوں کا طویل سلسلہ 'اداسیوں کی مجسم تصویریں' سفر کی گرد اور زندگی کی بے حاصلی تھی"۔(22)

خود ناصر نے اپنے ہاں رات کی معنویت کچھ اس طرح واضح کی ہے۔

"رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے......رات تخلیق کی علامت ہے، دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو' سمندروں میں

تموّج ہوتا ہے رات کو، خوشبوئیں رات کو جنم لیتی ہیں،
حتیٰ کہ فجر تک فرشتے رات کو اترتے ہیں۔ سب سے بڑی
وحی بھی رات کو نازل ہوئی"۔ (23)

ناصر نے "رات" کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا اس میں اسرار کا ایک جنگل چھپا ہوا ہے۔ ایک ہمہ گیر اداسی ہے لیکن یہ اداسی جان لیوا نہیں کہ پاؤں کی زنجیر بن کر رہ جائے......بلکہ جی چاہتا ہے کہ اسرار کے اس جنگل کی جانب ضرور جانا چاہیئے......اس خاموش سوئی رات میں کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے......اور شاید سوچنے کی یہی اکساہٹ ناصر کا مقصود ہے کہ رات کو سو کر نہیں گزارنا چاہیئے۔

صبح سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب　　ہائے کیا ہو گا اگر رات آئی
کوئی جب مل کے ہوا تھا رخصت　　دلِ بے تاب وہی رات آئی

ریگِ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا
سُونے صحرا چیخ اٹھتے ہیں آدھی آدھی راتوں کو
آتشِ غم کے سیلِ رواں میں نیندیں جل کر راکھ ہوئیں
پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو

دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو

گریۂ پیہم رہا ہے آنکھوں میں
رات بھر نم رہا ہے آنکھوں میں

سو گیا پچھلی رات کا جادو
کوئی اب لے چلے یہاں سے دور

اس کے آنے کی کچھ کہو یارو
نیند تو خیر آہی جائے گی

ہجومِ یاس ہے اور منزلوں اندھیرا ہے
وہ رات ہے کہ ستارے نظر نہیں آتے
......(برگِ نَے)

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشیٔ آواز نما کچھ کہتی ہے
سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوتے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے
جب رات کو تارے باری باری جاگتے ہیں
کئی ڈوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے

رات کتنی گزر گئی لیکن
اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں
دن اندھیرا ہے اور کنارہ دور
چاند نکلے تو پار اتر جائیں

رات بھر جاگتے رہے ہو بھلا کیوں ناصرؔ
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

ہم نشیں خاموش، دیواریں بھی سنتی ہیں یہاں
رات ڈھل جائے تو پھر چھیڑیں گے افسانہ کوئی

شب کی تنہائیوں میں پچھلے پہر
چاند کرتا ہے گفتگو ہم سے

اب تو آنکھ لگا لے ناصر دیکھ تو کتنی رات گئی ہے

آج کی رات نہ سونا یارو آج ہم ساتواں در کھولیں گے

ابھی تو رات ہے کچھ دیر سو ہی لے ناصر کوئی بلائے گا تو میں تجھے جگا دوں گا

نالۂ آخرِ شب کس کو سناؤں ناصر نیند پیاری ہے مرے دیس کے فنکاروں کو

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے خالی رستہ بول رہا ہے!
کیسی اندھیری رات ہے دیکھو! اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے
ساری بستی سو گئی ناصر تو اب تک کیوں جاگ رہا ہے

داتا کی نگری میں ناصر میں جاگوں یا داتا جاگے
(دیوان)

ناصر کے رت جگے گئے وقت کی تلاش کا وسیلہ تھے، یا گزرتے ہوئے وقت کی جانکاہی اور شدت سے فرار کا کوئی راستہ......حال کی بے ثمری کا رونا رونے کے لئے تھے یا ماضی کی رنگینیوں کو یاد کرنے کا کوئی ذریعہ' غور کریں تو ان میں دونوں پہلو تھے ماضی کی یادوں اور مستقبل کے بے تعبیر خواب اور درمیان میں حال کا وہ سلسلہ جس میں ناصر خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

"وہ رات میں ان چیزوں کو تلاش کرتے ہیں جنہیں دن

نے ان سے چھین لیا ہے یا خود روشنی میں ان سے کھو گئیں
۔ گم شدہ چیزیں انہیں ملتی نہیں ہیں، بلکہ وہ شاید خود بھی
کھو جاتے ہیں۔ لیکن رات کا شہر کم سے کم گم شدہ چیزوں
کی بازیابی کا امکان تو رکھتا ہے"۔ (24)

رت جگوں کے یہ سلسلے جاری رہے مگر آخر وہ وقت آگیا:

وہ میکدے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

اور پھر یوں ہوا کہ ان رت جگوں کا اسیر راتوں سے الگ ہو گیا

وہ ہجر کی رات کا ستارا، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

رات اس حادثے سے دل گیر ہو گئی، وہ جو اس کی خاموش تنہائیوں میں اس کا مونس تھا......وہ تو مر گیا......

کہیں کہیں کوئی روشنی ہے
جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے

کہاں ہے وہ اجنبی مسافر
کہاں گیا وہ اداس شاعر

اور رات کا یہ سوال تو اب بھی باقی ہے!

رنگِ میر کی حقیقت

اردو غزل کی صدیوں پر محیط طویل روایت میں سے جس شاعر نے ناصر کاظمی کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ میر تقی میر ہے۔ ناصر میر کو اپنے بہت قریب محسوس کرتا ہے یوں جہاں ذہنی سطح پر ناصر نے میر کو قبول کیا وہاں اپنے شعری مزاج کی تشکیل میں بھی میر سے اخذ و قبول کیا۔ ناصر کی شاعری پر میر کے اثرات دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ناصر نے یہ رنگ شعوری طور پر اپنائے ہیں۔ ممکن ہے کہ ناصر کی میر پسندی اور پھر گفتگو میں بار بار میر کا نام لینا غالب کے مقابلے میں میر کو نمایاں کرنے کا ایک بہانہ ہو۔ ناصر دراصل شعر میں غالب کے سے فکر و فلسفے کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن غالب کی مقبولیت اور اردو شعروادب پر اس کے اثرات کو زائل کرنا اس کے بس میں نہیں تھا تو یوں میر کا نام لینا اس کے لئے غالب کے اثرات کم کرنے کا ایک ذاتی سا وسیلہ بھی ہو سکتا ہے...... بہر صورت جو بھی ہو یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ ناصر کے ہاں میر کے اثرات ملتے ہیں۔

سب سے پہلے جس بات کی وجہ سے ناصر نے میر کو اپنے قریب محسوس کیا وہ یہ تھی کہ ناصر کے عہد اور میر کے عہد میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ ذہنی انتشار، بے یقینی، باہمی اعتماد کا فقدان، خوف و ہراس، ہنستی کھیلتی بستیوں کی تاراجی اور اس قسم کے کئی پہلوؤں میں دونوں کے زمانوں میں مماثلت نظر آتی ہے...... اس حقیقت کی وضاحت

کرتے ہوئے خود ناصر نے لکھا ہے۔

"یہ اتفاق ہے کہ میر صاحب کی شاعری کے بعض اہم
عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی اور اجتماعی محرکات میں
چند باتیں مشترکہ نظر آتی ہیں......اس عہد کی پشت پر بھی
دنیا کی سب سے بڑی ہجرت اور ایک بڑے تاریخی انقلاب
کے محرکات ہیں۔ ہجرت کی واردات جو انسان کا مقدر
ہے ایک دفعہ پھر ہماری قوم کی تاریخ میں نمودار ہوئی اور
اب وہ ہمارے دور کی مرکزی روحانی واردات بن گئی
ہے......ایک بار پھر ہماری بنی بنائی قدریں چکنا چور ہو
گئیں۔ آج ہم نئی قدروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ گو
میر صاحب کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بڑا بُعد ہے'
دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ آج کے شاعر کے سامنے پہلے
سے بھی کہیں وسیع منظرِ حیات کھل گیا ہے مگر واقعات کی
مماثلت کی وجہ سے میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے
سے مل گیا ہے۔ وہی غریب الوطنی' وہی قافلوں کا سفر'
وہی رہزنی' آئے دن حکومت کا بدلنا' خوراک کی قلت'
سیلاب کی تباہی اور پرانی اقدار کا بکھر جانا اور رواج ہنر اور
وفا پیشگی کا اٹھ جانا غرض یہ حوادث ہمیں بھی دیکھنے
پڑے"۔(25)

ایک اور مقام پر ناصر نے میر کے ساتھ اپنے ذہنی تعلق کو واضح کیا ہے۔

"میر کے جو بُرے بھلے انتخاب ہوئے ہیں، ان میں میر سے انصاف نہیں ہوا ہے۔اس کے بہتر نشتروں کا ہلاک میں بھی ہوں لیکن ان نشتروں پر بات ختم نہیں ہوتی۔ مجھے تو اس کی غیر معروف غزلوں میں بھی بعض اشعار یا مصرعے پدم سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے اور پھنکارتے نظر آتے ہیں۔ یہ سانپ انگشت برابر ہوتا ہے مٹی کے رنگ کا......عام نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا، میں نے وہ زہر بھی سہارا ہے"۔ (26)

اس حقیقت کا ایک اور اظہار ناصر کے ہاں کچھ یوں ہے۔

"جگنو پکڑنے اور سنگریزے چننے کے ساتھ ساتھ "لفظِ تازہ" کی تلاش تو مجھے ابتدا ہی سے تھی۔ اب انہی لفظوں میں جہانِ معنی نظر آنے لگا۔ میر کی سیدھی سادی غزلوں اور چھوٹی چھوٹی اور پر سکون بحروں اور عام لفظوں کی تہہ میں مجھے اپنے جذبات کا اضطراب محسوس ہونے لگا"۔(27)

ناصر کی یہ اپنی آراء میر اور اس کے ذہنی روابط کا سراغ دیتی ہیں۔ یہی ذہنی رابطے ناصر کی غزلوں میں رنگِ میر کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں اور اس کی پہلی بنیاد ہجرت ہے۔ میر نے دہلی سے لکھنؤ ہجرت کی اور ناصر کاظمی نے انبالے سے لاہور ہجرت کی' دونوں کے مقاصد مختلف تھے مگر اثرات دونوں کے ہاں کم و بیش ایک ہی نوعیت کے تھے۔ میر کو بار بار دلی کی یاد نے ستایا اور ناصر کاظمی نے بھی رہ رہ کر اپنے بچھڑے وطن کو یاد کیا۔ میر نے کہا تھا

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اپنے وطنِ مالوف کے حوالے سے ناصر کاظمی کے یہ اشعار دیکھیئے کہ ان میں بھی اس سے ملتی جلتی فضا نظر آئے گی۔

انبالہ ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی
اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا! لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ معدنی
جلتا ہوں، داغِ بے وطنی سے مگر کبھی روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی
(نشاط خواب)

غریب الوطنی کے اسی کرب کا اظہار ناصر کے ہاں جابجا ملتا ہے۔

آج غربت میں بہت یاد آیا اے وطن تیرا صنم خانۂ گل
آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل
ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

اور......

مجھے تو خیر وطن چھوڑ کے اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے

ہجرت کے تجربے کے حوالے سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ ہجرت کا تجربہ ناصر کے ہاں میر کی نسبت کہیں زیادہ شدت سے وارد ہوا ہے۔ میر نے بادشاہوں کی

آنکھوں میں سلائیاں پھرتی دیکھی تھیں تو ناصر نے بھی بربادیوں اور تباہیوں کے ایک طویل سلسلے کا نہایت دردمندی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
اب کی فصلِ بہار سے پہلے رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ

میر کی شاعری اپنے عصری آشوب کی روداد ہے۔ وہ تہذیب کے لٹتے اور اجڑتے گھروں کی کہانی ہے۔ اس آشوب میں زندگی کی اعلیٰ اقدار ملیامیٹ ہو گئیں۔ زندگی آگ اور ماحول دھواں ہو گیا...... میر کی غزل انہی حادثوں سے عبارت ہے...... ناصر کاظمی کے ہاں بھی اسی سے مماثل انداز ملتا ہے۔ اس کے ہاں اپنے عہد کے المیے اور آشوب' ایک تہذیب کی بربادی' اچھے لوگوں کا فقدان اور زندگی کی بلند اقدار کی گم شدگی جیسے موضوعات بلا شبہ میر کے اثرات کی گواہی ہیں۔ تہذیب کے حوالے سے گرتی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی دیوار کا استعارہ جہاں میر کے ہاں ملتا ہے وہاں ناصر کاظمی کے ہاں بھی کم و بیش یہ استعارہ اسی تناظر میں نظر آتا ہے اس کے ہاں "یادوں کے بجھے ہوئے سویرے" "شاخوں پر جلے ہوئے بسیرے' اور "راستوں میں ہی ڈیرے جما لینے" کے مناظر اس تہذیب اور ماحول سے جدائی کے کرب کا اظہار ہیں جو حادثوں سے پہلے آباد اور پر رونق تھا۔

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کے شاخوں پر جلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو قافلوں نے رستے میں جما لئے ہیں ڈیرے

"دیوار" کے استعارے کے علاوہ (اوپر ذکر ہو چکا ہے) شہر، گلی، گھر اور اس نوع کی بہت سی علامتیں اور استعارے ناصر کے ہاں جابجا ملتے ہیں جو رنگِ میر کا عکس ہے۔ ان استعاروں کے سیاق و سباق میں جو مضامین میر نے پیش کئے ہیں انہی کی بازگشت ناصر کاظمی کے ہاں ملتی ہے۔

یہاں اک شہر تھا شہرِ نگاراں نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی

شہر سنسان ہے کدھر جائیں خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

شور برپا ہے خانۂ دل میں کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

اس کے علاوہ......

"ناصر کی ماہ زدگی میر کی یاد دلاتی ہے لیکن اس میں زیادہ شعریت اور رعنائی ہے"۔(28)

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور چاند نکلے تو پار اتر جائیں

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر چاند کس شہر میں اترا ہو گا

غم اور داخلیت پسندی کا جو رنگ ناصر کے ہاں نظر آتا ہے اس میں بھی میر کے گہرے اثرات موجود ہیں۔

"ان کو میر سے بطور خاص ربط ہے۔ گویا میر کی دروں بینی اور داخلیت پسندی کا سارا فن اور کمال ان پر آئینہ ہے اور وہ خود بھی دروں بیں واقع ہوئے ہیں"۔ (29)

کچھ کہہ کے خموش ہو گئے ہم　　قصہ تھا دراز کھو گئے ہم

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے　　خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے

ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا　　یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہلِ دنیا نے

تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر　　مرے لئے کوئی شایانِ التماس نہیں

ناصر کاظمی کی غزلوں میں "رنگِ میر" کے حوالے سے اکثر نقادوں کے ہاں بالعموم ایک اتفاق رائے نظر آتا ہے کہ دونوں میں مماثلت موجود ہے یا یہ کہ ناصر نے میر کے گہرے اثرات قبول کیے۔ تاہم شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں دونوں کا موازنہ بلا جواز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

"ممکن ہے انہیں میر کی طرح کا حزنیہ شاعر کہہ کر جھگڑا نپٹایا جا سکے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا مزاج میر سے بہت مختلف تھا"۔ (30)

شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں گہری بصیرت، تجربے کی وسعت، تہہ داری

اور معنویت، خیال کی بلندی اور پختگی اور اظہار وبیان کی بھر پور اور بلیغ صلاحیت جو میر میں ہے۔ ناصر میں موجود نہیں۔ میر کے مقابلے میں ناصر بالکل ناتجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً عشقیہ شاعری کی مثال دیکھیں تو شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں میر کی شاعری ایک ایسے ذہن کی نشان دہی کرتی ہے جو کرب اور فرحت، امید اور خوف، شکست اور فریب آرزو کی تمام منازل طے کر چکا ہے۔ بصیرت کی یہ گہرائی اور تجربے کی ایسی وسعت ناصر کے ہاں مفقود ہے۔ (31)

شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے میں میر اور ناصر کا موازنہ یا ناصر کے ہاں میر کے اثرات تلاش کرنا بے سود اور بلا جواز ہے۔ تاہم راقم کی رائے میں دونوں کے ہاں مماثل مضامین ملتے ہیں۔ واقعاتی طور پر دونوں کے زمانوں میں مماثلت پائی جاتی ہے اور پھر ناصر نے خود واضح طور پر اپنے ہاں میر کے اثرات قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس وجہ سے ناصر کی غزلوں میں اگر رنگِ میر جھلکتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔

سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسے گا

(ناصر کاظمی کا اسلوب)

ناصر کاظمی کی غزل کا عمومی لہجہ دھیما ہے۔ تاہم کہیں کہیں خطابیہ انداز اور بلند آہنگ لہجہ بھی نظر آتا ہے۔ "برگِ نے" کی غزلوں میں دھیمے اور بلند آہنگ لہجے کی آمیزش نظر آتی ہے۔ "دیوان" میں بلند لہجے کی زیادہ غزلیں نظر آتی ہے۔ "دیوان" کی بعض غزلوں کا لہجہ اقبال اور غالب کے لہجوں سے ملتا جلتا ہے۔ مثلاً

تو اسیرِ بزم ہے ہم سخن' تجھے ذوقِ نالۂ نے نہیں

ترا دل گداز ہو کس طرح یہ ترے مزاج کی لے نہیں

کہاں اب وہ موسم رنگ و بو کہ رگوں میں بول اٹھے لہو

یونہی ناگوار چبھن سی ہے کہ جو شاملِ رگ و پے نہیں

میں ہوں ایک شاعرِ بے نوا مجھے کون چاہے مرے سوا

میں امیرِ شام و عجم نہیں' میں کبیرِ کوفہ و رے نہیں

اور......

لفظوں میں بولتا ہے رگِ عصر کا لہو لکھتا ہے دستِ غیب کوئی اس کتاب میں

لیکن یہ لہجہ ناصر کے اپنے منفرد لہجے کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ غزلیں مشاعروں بالخصوص ایسے مشاعروں کے لئے لکھی گئیں جو اقبال اور غالب کی یاد میں منعقد کئے گئے ورنہ ناصر کے لہجے کا دھیما پن اور دبا دبا سا انداز ہی صحیح طور پر اس کا اپنا لہجہ ہے۔

اب وہ دریا' نہ وہ بستی' نہ وہ لوگ کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

گھر کے آنگن میں آدھی رات مل کے باہم کہانیاں کہنا

دن چڑھے چھاؤں میں ببولوں کی رمِ آہو کو دیکھتے رہنا

سو گئے لوگ اس حویلی کے ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

لہجہ اسلوب کا حصہ ہے اور ناصر کی غزل کی جن خصوصیات نے اہل ادب کو چونکایا ان میں ان کا اسلوب بھی شامل ہے۔

"ناصر کی لے' اس کی اشاریت، ایمائیت، رمزیت، اس کے الفاظ کا صوتی آہنگ اس کی زبان کی روانی کا ترنم اس کے منتشر اشعار کا تسلسل اور ان سب کے امتزاج سے پیدا ہونے والی ایک مجموعی فضا ناصر کی غزلوں میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس فضا نے اس کی ہئیت کو جدت سے ہم کنار کیا ہے۔ ناصر کی غزلوں میں یہ تجربات اردو غزل کی ہئیت میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں"۔ (32)

ناصر کے ہاں شعر اور مصرع ایک خاص برجستگی رکھتا ہے۔ ان میں تعقید قطعاً نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں ناصر کی ایک بہت بڑی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے اشعار اور مصرعے اپنی نثری ترتیب بھی برقرار رکھتے ہیں، اس کے باوجود الفاظ کا شعری آہنگ متاثر نہیں ہوتا۔

ناصر کی غزل لہجے کے اعتبار سے بھی اس کی اپنی محسوس ہوتی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کوئی شعر کسی لہجے میں ڈھل نہ سکے تو وہ ناصر کا شعر نہیں ہو سکتا۔ اس کا لہجہ فطری بول چال اور گفتگو کا لہجہ ہے۔

غزل میں لسانی اعتبار سے وہ روایت کے اثرات قبول کرتا ہے لیکن اس کے اپنے عہد کی شعری زبان بھی اس کے ہاں بار بار چہرہ دکھاتی ہے۔

"یہ زبان روزمرہ گفتگو کی زبان ہے اور ایسے ذہنی رویوں

کی زبان ہے جن سے ہم عصر نسلیں گزر رہی ہیں۔ ناصر
کاظمی کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے ہماری روز مرہ گفتگو کو
غزل میں بدل دیا ہے۔ یہ کام اتنا آسان شاید نہیں ہے
کیوں کہ روز مرہ گفتگو کو غزل میں بدلنے کے لئے شدید
تخلیقی اور جذباتی طبیعت کا ہونا لازمی ہے ۔ناصر کاظمی کی
تخلیقی وذہنی قوت نے زبان کو شاعری میں بدل کر شاعری
کے بنیادی فکر کو ایک ایسے زمانے میں قائم کیا ہے جو
شاعری کو محض لفظوں کی کمپوزیشن سمجھتا ہے ۔ ناصر
کاظمی نے روز مرہ زبان کو غزل میں بدل کر ایک مزاج کی
تشکیل کی ہے اور ایک نیا راستہ دیا ہے' یہی نہیں بلکہ غزل
کی روایت میں لفظ' جذبے اور شعر کی ایک نئی تکنیک ایجاد
کی ہے"۔(33)

اس کے ہاں لفظ بے جواز نہیں ہیں بلکہ ہر لفظ کا فنی اور موضوعاتی جواز موجود ہے۔ ناصر کی غزل کی تکنیک کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار میں تکمیل کا حسن (Beauty of Perfection) موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہے' اشعار میں تکمیل کا حسن ہر شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔ لفظوں کے آہنگ کے ذریعے موسیقی کا عنصر بھی ناصر کے ہاں جگہ جگہ ملتا ہے......ان تمام فنی خوبیوں کے علاوہ ناصر کی غزل کی سب سے بڑی خوبی جو فنی اعتبار سے اس کو حد درجہ بلند پایہ بنا دیتی ہے وہ اس کی "امیجری" ہے۔ اسے بجا طور پر اردو غزل کا ایک بڑا تمثال آفریں شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔(34)

ناہید قاسمی کے الفاظ میں ناصر کی امیجری ایک بالکل نئی تازہ پکچر گیلری ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس میں ناصر کی اپنی انفرادیت جھلکتی ہے۔ یہ امیجری نئی اور اچھوتی ہے لیکن مانوس ہے۔

> "نئے اشاروں اور نئی علامتوں نے ان کی غزل کو ایک نئی فضا سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے نئی نسل کی مخصوص اور جذباتی کیفیت کے اظہار کے لئے ان گنت نئے پیکر تراشے ہیں اس لئے ان کی غزلوں کی امیجری بالکل نئی اور اچھوتی...... لیکن مانوس معلوم ہوتی ہے"۔ (35)

ناصر کاظمی کے ہاں تمثال آفرینی کے بڑے ناپید نمونے ملتے ہیں ان میں ناصر کا گہرا مشاہدہ ار دیدہ ریزی جھلکتی ہے۔ اس نے جو منظر تخلیق کئے ہیں وہ ان کے باطنی اسرار اور محشر سے پوری طرح آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے ان میں دیکھی بھالی سچائیاں نظر آتی ہیں...... ان تمثالوں میں ناصر کے حواس نے اس حساس آئینے کا کام دیا ہے جس نے خفیف سی خفیف لرزش کو بھی پوری طرح منعکس کیا ہے۔ ناصر نے گل کو دیکھ کر اگر تخلیق گل کے بارے میں سوچا ہے تو ناصر کا مشاہدہ رگِ گل کے اندر اتر گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ناصر کا تخیل اس سفر میں اس کے ساتھ پوری طرح شامل ہے اور پھر تمثال آفرینی کا فن تکمیلِ حسن تک تخیل کے وسیلے ہی سے تو پہنچتا ہے۔ ...... "برگِ نَے" اور "دیوان" میں تمثال آفرینی بھر پور طریقے سے ہوئی ہے ("پہلی بارش میں بھی تمثالیں کثرت سے ہیں ان کا جائزہ علیحدہ لیا جارہا ہے)

ناصر کی تمثالوں میں بہت تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ بہت خوبصورت مناظر ہیں۔ ذرا یہ رنگ دیکھتے ہوئے چلیں کہ اس منظر نامے میں ناصر نے کیسے کیسے خوشنما مناظر تخلیق کئے ہیں۔

ساکت بصری تمثالیں ★

"لپٹ کے سو رہو زنجیرِ در سے"، "اداسی بال کھولے سو رہی ہے"، "یادوں کے بجھے ہوئے سویرے"، "برگِ گل کی چھاؤں"، "صنم خانۂ گل"، "دھیان کی سیڑھیاں"، "پھولوں کے خزانے"، "جسم چاندنی کا شہر"، "سنسان آسمان"، "چپ کھڑے مکاں"، "انگشتِ حنائی"، "شبِ خزاں کی خنک چاندنی کا نظارا"، "شہرِ گل"، "بجھا بجھا سا ایک دیا"، "پردۂ گل"،...... "رستے کہکشانی"، "سر جھکائے شامِ فراق"، "سنسان گلی"، "بے خواب دریچہ"، "چپ چاپ طیور"، "بام و درِ خاموش"، "میتِ شہرِ بے کفن"، "بستی چین سے سو رہی ہے"، بجھے دنوں کا ڈھیر۔

بصری حرکی تمثالیں

"اڑ گئے شاخوں سے طیور"، "قافلہ بگولوں کا"، "دکھوں کی تیز ہوا"، "اوا اوا رقصاں"، "ہوا زنجیر سی پہنا رہی ہے"، "پاؤں چلنے لگی جلتی ہوئی ریت"، "وشت سے جب کوئی آہو نکلا"، "درد کی طغیانیاں"، "وا ہوا درِ میخانۂ گل"، "رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری"، "کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے"، "ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے"، "دیدۂ حیراں"، "اشکوں میں ڈھل گئی تیری صورت کبھی کبھی"۔

"کرن پریاں اترتی ہیں"، "دیوار سی گری ہے"، "دور کھڑے خالی ہاتھ ہلاتے ہیں"، "پتوں کا میلہ"، "ناؤ چل رہی ہے"، "آگ جل رہی ہے"، "ابر اٹھا ہے جھوم کر"، "لگی ہے آگ کنارے پر"، "چلتا دریا"، "تیز پون"، "نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں"، "دیا جلتا رہا ہے"، "سایہ ہے میرا ہم سبو"، "نیند اڑا کر اڑ گئی چڑیا"، "دکھ کی لہر"،

★ ان تمثالوں میں سے اکثر ناہید قاسمی کی کتاب "ناصر کاظمی، شخصیت اور فن" سے ماخوذ ہیں۔

"بیتے لمحوں کی جھانجھن"، "بارش تیروں کی"، "مثالِ گردِ سفر گیا وہ"۔

سمعی تمثالیں

"پھر کوئی نغمہ گلوگیر ہوا"، "پھر پتوں کی پازیب بجی"، "مجھ سے باتیں کرتا تھا"، "خاموشی تصویروں کی"، "پیاسی کرلاتی کونجیں"، "ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت"، "آہ بھی نغمہ بنا چاہتی ہے"، "شور برپا ہے خانۂ دل میں"، "کوئی دیوار سی گری ہے ابھی"، "ریل کی گہری سیٹی سن کر"، "رات کا جنگل گونجا ہوگا"، "بیتے لمحوں کی جھانجھن"، "خموشی انگلیاں چٹخا رہی ہے"، "دل کی دھڑکن کہتی ہے"، "گھنٹیوں کی صدا سوگئی"،...... "سازِ ہستی کی صدا غور سے سن"، (ساری غزل)

خوشبو کے مناظر

"خوشبوؤں کی اداس شہزادی"، "مہکی ہوئی سانسیں"، "رستوں میں اداس خوشبوؤں کے"، "پھولوں نے لٹا دیئے خزانے"۔

مرکب تمثالیں (حسِ سامعہ + حسِ بصارت)

"سن کے طاؤسِ رنگ کی جھنکار"، "دن کا سنہرا نغمہ سن کر"، "پردۂ گل ہی سے شاید کوئی آواز آئے"، "بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز"، "کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے"، "گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے"، "زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن"، "سن کے آوازۂ زنجیرِ صبا"، "اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی"، "چپ کھڑے ہیں مکاں"، "چلتا دریا"، "دن کا چراغ نکلا گل ہو گئے ستارے"، "دنیا کے شور و غل میں دل اب کسے پکارے"، "سونے صحرا چیخ اٹھتے ہیں آدھی آدھی راتوں کو"، "کیسا سنسان ہے سماں"،

"پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا"، "سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل"۔

استعارے اور علامتیں

تمثال آفرینی کے علاوہ ناصر کے شعری اسلوب میں بعض استعاروں اور علامتوں کی بہت اہمیت ہے ان استعاروں کی معنویت جانے بغیر اس کے اشعار کو سمجھنا دشوار ہوگا۔ استعارہ کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وجدانی کیفیات کے تابع ہوتا ہے۔ استعارے اور علامت کے ذریعے شاعر اپنے اظہار اور ابلاغ کو بیک وقت تخلیقی، خوشنما اور موثر بناتا ہے اور ناصر کے ہاں بہت سے ایسے استعارے اور علامتیں ملتی ہیں جو کسی نہ کسی داخلی کیفیت کی ترجمان ہیں اور اس کے شعری تجربے کا بہتر اظہار ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پہلو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ناصر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور غزل میں براہ راست اظہار کی بجائے ایمائیت اور رمزیت کے پردے میں بات کی جاتی ہے اور استعارہ اسی رمزی اور ایمائی اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔

ناصر کے ہاں جو استعارے ملتے ہیں، ان میں سے چند کا تذکرہ اس باب میں پہلے بھی ہوا ہے تاہم اُس تذکرے میں زیادہ تر اس کی غزل کے معنوی تجزیے پر زور دیا گیا ہے اس کے اُسلوبی پہلو پر کم توجہ دی گئی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ان اشاروں اور علامتوں کو قدرے تفصیل سے یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔ ان استعاروں میں سفر، رات، ہوا، شہر (بالخصوص رات کا شہر) گھر، پانی، چاند وغیرہ شامل ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی اہمیت اور معنویت ہے کسی کا تذکرہ کم ہے اور کسی کا زیادہ۔ سب سے زیادہ جن استعاروں کو ناصر نے برتا ہے ان میں سفر، رات، ہوا اور شہر ہیں۔

سفر کا استعارہ ناصر کے ہاں بہت تسلسل اور تواتر کے ساتھ ملتا ہے اور اس

کی کئی معنوی جہتیں ہیں۔ سفر کے اس استعارے میں ناآشنا اور نامانوس راستوں کے سفر، دشت نوردی، گھر سے دوری، مانوس منزلوں سے بچھڑنے، ہم نفسوں اور ہم جلیسوں سے محرومی، تنہائی، راہ نوردی میں آبلہ پائی، قافلے، گھنٹیاں، بے نشاں منزلوں کا ذکر اور سب سے بڑھ کر ایک نا تمام سفر کی شبیہیں ملتی ہیں۔ ناصر کے ہاں سفر اور اس کی اپنی شخصیت اتنی گھل مل گئی ہے کہ وہ خود کو شاعر کے ساتھ ساتھ مسافر یا مسافر شاعر کہتا ہے۔

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

کہیں کہیں کوئی روشنی ہے
جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے
کہاں ہے وہ اجنبی مسافر
کہاں گیا وہ اداس شاعر

ناصر کے ہاں سفر کا استعارہ معنوی طور پر وقت، عمر، تہذیب، نقل مکانی، منزل، بے وطنی اور آگہی کا حوالہ بنتا نظر آتا ہے۔ اس سفر میں مسافر جس سفر پہ رواں دواں ہے وہ ان جانے اور ان دیکھے جہانوں اور زمانوں کا سفر ہے جس سے واپسی کا ارادہ نہیں لیکن بچھڑے دیاروں کی یاد ہمیشہ اس کے پاؤں میں زنجیر بنی رہتی ہے وہ دشت دشت، قریہ قریہ اور بستی بستی سفر کرتا ہے مگر منزل بے نشان نظر نہیں آتی۔ شاید یہ بیتے دنوں کے کھوج کا سفر بھی ہے۔ اس سفر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تسلسل ہے اور یہ نا تمام سا نظر آتا ہے۔

میں تو بیتے دنوں کی کھوج میں ہوں　　تو کہاں تک چلے گا میرے ساتھ

ابھی وہ دشت منتظر ہیں مرے　　جن پہ تحریر پائے ناقہ نہیں

مجھ کو اور کہیں جانا تھا　　بس یونہی رستہ بھول گیا تھا

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے　　غمِ صد کارواں دیکھا نہ جائے

اس سفر میں "جنگلوں"، "کڑی دھوپ" اور "بھاری راتوں" کا ذکر بھی ملتا ہے جو راستے کی دشواری کو ظاہر کرتا ہے۔

جنگل میں ہوئی شام ہم کو　　بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

یاد کی نگری کوسوں دور　　کیسے کٹے گی بھاری رات

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

اس سفر میں بعض موقعوں پر اس کی بے مقصدیت اور بے جہتی کا گمان بھی ہوتا ہے اور ایک ایسی نیم دلی اور تھکن بھی محسوس ہوتی ہے کہ جس میں ہر پڑاؤ اور راستے میں آنے والی ہر بستی میں ٹھہرنے کی خواہش ہوتی ہے۔

جہاں کوئی بستی نظر آگئی　　وہیں رک گئے اجنبی قافلے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے رستے میں جما لئے ہیں ڈیرے

نہ جانے کہاں رک گئے قافلے مسافر بڑی دور جا کر ملے

سفر کا استعارہ دراصل ناصر کے ہجرت کے تجربے کی دین ہے۔ جس میں ماضی کی یاد ہے' حال کے جاں گداز مرحلے ہیں اور مستقبل کے ان جانے اندیشے ہیں۔ اس سفر میں قافلے ،گھنٹیاں ، راستے اور اجنبی بستیاں ملتی ہیں اپنے وطن سے بچھڑ کر ان کا رویہ ایک ایسے مسافر کا رویہ نظر آتا ہے جو مسلسل سفر میں ہے اور اس کو کہیں قرار نہیں ۔ یہ ایک ذہنی خانہ بدوشی ہے جو ناصر کی زندگی اور شاعری پر چھائی محسوس ہوتی ہے۔ ایک خوبصورت تہذیبی زندگی سے بچھڑ کر اس اجنبی مسافر کو کہیں عافیت اور قرار محسوس نہیں ہوتا اور وہ یوں مسلسل سفر میں ہے کہ شاید اس سفر کے اس پار وہ منزل نظر آجائے جس کی تلاش کا اسے سودا ہے۔

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر' نگر نگر
کہاں کھو گیا مرا قافلہ ، کہاں وہ گئے مرے ہم سفر

کیا خبر خاک سے ہی کوئی کرن پھوٹ پڑے
ذوقِ آوارگیٔ دشت و بیاباں ہی سہی

رات کا حوالہ بھی سفر کی طرح ناصر کی زندگی اور شاعری میں بہت زیادہ

اہمیت رکھتا ہے جس کا تفصیلی تجزیہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس استعارے کی معنویت کے کچھ اور پہلو اجاگر کیئے جا رہے ہیں۔ شہر کی رات میں آوارہ گردی ناصر کی شعری دنیا میں ایک کلیدی علامت ہے۔ رات کو بھی ناصر نے اپنی داخلی واردات کے حوالے سے دیکھا ہے۔ وہ رات میں ان چیزوں کو تلاش کرتا ہے جنہیں دنیا نے اس سے چھین لیا ہے یا وہ دن کی روشنی میں کہیں گم ہو گئیں۔ اس لحاظ سے رات اس کے ہاں تلاش کا استعارہ ہے۔ یہ رات خاموش' خوف زدہ لیکن اس کی ہمدرو نظر آتی ہے جس میں اس کو عافیت محسوس ہوتی ہے۔

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے خالی رستہ بول رہا ہے

شب کی تنہائیوں میں پچھلے پہر چاند کرتا ہے گفتگو ہم سے

بازار بند، راستے سنسان، بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

رات اتنی گزر گئی لیکن اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشیٔ آواز نما کچھ کہتی ہے

کیا لگے آنکھ کہ پھر دل میں سمایا کوئی
رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سایا کوئی

میری رات کا چراغ میری نیند بھی ہے تو

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

ناصر کے خیال میں رات تخلیق کی علامت ہے۔ لیکن جیسے جیسے ناصر کے گردوپیش میں تبدیلی آتی گئی۔ اس کے ہاں رات کا بیان بھی بدلتا گیا۔ جن دنوں وہ اور ان کے ساتھی رت جگوں کے اسیر تھے ان دنوں میں ناصر کے ہاں رات کا بیان ایک تخلیقی تجربے کے طور پر ہے اور رات کی حمد وثنا کا پہلو نمایاں ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ رت جگوں کے ساتھی ایک ایک کر کے بچھڑتے گئے تو رات میں اسرار، خوف، اجنبیت، ویرانی، اداسی، لاتعلقی، اور غریب الوطنی کی کیفیات شدید ہوتی گئیں۔

شہر سوتا ہے، رات جاگتی ہے
کوئی طوفانِ ہے پردہ در خاموش

یہ کالے کوس کی پرہول رات ہے ساتھی
کہیں اماں نہ ملے گی تجھے کنارے پر

صدائیں آتی ہیں اجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر

ناصر کی غزلوں میں ہوا کے استعارے کا استعمال تواتر کے ساتھ ملتا ہے جس کے ذریعے اس نے یاد، تعلق اور وابستگی، آگاہی، پیغام اور خواہشات کے مفاہیم پیش کئے ہیں۔ ہوا بظاہر ایک لمسیاتی احساس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی' لیکن شعر وشاعری میں اسے اکثر پیغام رسانی کے وسیلے کے طور پر برتا گیا ہے۔ ہوا پیاروں کے پیغام لاتی ہے' ان کی یاد دلاتی ہے۔ ان سے تعلق اور وابستگی کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کے شب وروز سے آگاہ کرتی ہے، اور ان کو شاعر کے حالات سے باخبر کرتی ہے اور ناصر کے ہاں ہوا کے بیان میں یہ ساری معنوی جہتیں ملتی ہیں۔

یہ ڈھونڈتا ہے، کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کناروں پر

چیخ رہے ہیں خالی کمرے　　شام سے کتنی تیز ہوا ہے

ریگِ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا
سونے صحرا چیخ اٹھتے ہیں، آدھی آدھی راتوں کو

جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِ شام　　برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں
زلفوں کے دھیان میں لگی آنکھ　　پرکیف ہوا میں سو گئے ہم

ہوا زخموں کو بھی چھیڑ سکتی ہے، دلوں کے الاؤ روشن کر سکتی ہے اور سرد جذبوں کو جگا سکتی ہے۔

کرم اے صرصرِ آلامِ دوراں دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے

ہوا کشش کی علامت بھی ہے۔

شہرِ لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

ہوا میں یاد، پیغام اور آگہی بھی ہے۔

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سن

پھر چاند کو لے گئیں ہوائیں
پھر بانسری چھیڑ دی صبا نے

تازہ رس لمحوں کی خوشبو لے کر
گل زمینوں کی ہوا پھر آئی

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

اس کے علاوہ ہوا آنے والے انجانے دنوں، اندیشوں اور نادیدہ زمانوں کی خبر بھی دیتی ہے جن میں کچھ ہونے والا ہے۔

کبھی بھور بھئے، کبھی شام پڑے، کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رت کی ہوا کچھ کہتی ہے!

ناصر کی غزلوں میں شہر کا ذکر بھی بہت ملتا ہے۔ یہ "شہر ستم گر" اور "شہر بے چراغ" ہے جس میں ناصر ان چیزوں کی تلاش کرتا ہے جو گم ہو گئی ہیں۔ وفا، محبت، مروت، دوستی، خلوص، ہمدردی اور یگانگت وہ قدریں ہیں جن کی ناصر کو تلاش ہے۔ مگر وہ ناقدر شہر کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی ہیں۔ اس لحاظ سے ناصر کے ہاں شہر کا استعارہ معاشرے کی دشمنی، ریاکاری، منافقت، بے حسی، زر پرستی، کٹھور پن، سنگ دلی، ایک خاص طرح کی لاتعلقی (ایک دوسرے سے) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس شہر کے خالی گھر اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ پہلے ان گھروں میں کوئی رہتا تھا۔ رات کا سنسان شہر یا شہر کی سنسان رات' اداسی میں ناصر کی شہر گردی دراصل اس بات کی علامت ہے کہ ناصر کو ان گم شدہ اشیاء کی تلاش ہے' جو ایک زمانے تک شہر اور اہل شہر میں نظر آتی تھی، مگر اب نئے زمانے نے ان کی اہمیت ختم کر دی ہے۔ ناصر کا کمال یہ ہے کہ اس نے شہر کا بیان خود میں ڈوب کر کیا ہے' اس کی داخلی کیفیات ہی ہیں جو دراصل اس بیان کو دلآویز بناتی ہیں۔ یہ بیان گہرے المیے کے احساس سے عبارت نظر آتا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ناصر

نے واقعاتی اور حقیقی طور پر اس کرب کو محسوس کیا ہے جو شہر کی عمومی فضا اور اہل شہر کے رویوں کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اسے بے دلوں کے شہر سے وحشت ہوتی ہے، کبھی ایک انجانا سا خوف بھی محسوس ہوتا ہے اور کبھی وہ شہر کی بے چراغ گلیوں میں گم شدہ حوالوں کی تلاش سے دوچار نظر آتا ہے۔

تیرے ساتھ گئی وہ رونق
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے

اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

کن بے دلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کے نور نہ باتوں میں تازگی

وہ شاعروں کا شہر، وہ لاہور بجھ گیا
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

یہاں اک شہر تھا، شہرِ نگاراں نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، میں باہر جاؤں کس کے لئے
وہ شہر میں تھا تو اس کے لئے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لئے

کس سے کہوں، کوئی نہیں، سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میتِ شہر بے کفن

ان استعاروں کے علاوہ ناصر کے ہاں "گھر" انسانی رشتوں کے تقدس کو پیش کرتا ہے جو اَب خالی ہے گویا شکست و ریخت سے دوچار ہوا ہے۔ گھر ایک خاص تہذیب اور معاشرت کا نمائندہ بھی ہے جو ٹوٹ گیا اور بکھر گیا...... تاہم اس کے ساتھ ساتھ ایک گوشۂ عافیت بھی ہے۔ "چاند" ناصر کے ہاں حرارت، سکون اور آگہی کا پتہ دیتا ہے اور "پانی" زندگی، زرخیزی اور آگہی کی ترجمانی کرتا ہے۔

پہلی بارش۔ ایک منفرد اظہاری تجربہ

ناصر کاظمی کے ذہن کی ساخت میں حکایات اور اساطیر کا گہرا دخل ہے۔ وہ اپنے تجربوں کے اظہار کے لئے جو پیٹرن بناتا ہے ان میں اس کا حکایاتی اور اساطیری مزاج واضح طور پر جھلکتا ہے۔ ناصر کہانیاں کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے ناصر کاظمی جب اپنے تجربات کو حکایاتی حوالوں سے شناخت کرتا اور کرواتا ہے تو یہ حوالے اپنا ایک تہذیبی پس منظر بھی رکھتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناصر ان حکایاتی حوالوں سے ایک منتشر داستان کی شیرازہ بندی کر رہا ہے "رنج سفر" "گل زمینیں"، "سراغ گل"، "شہرِ بے چراغ"، "رنج غربت"، "ساتواں در"، "کرن پریاں" اور اس نوع کے دیگر الفاظ اپنے اندر ایک حکایاتی اور اساطیری رنگ رکھتے ہیں جو ناصر کو حد درجہ مرغوب ہے اور اس کے فن کا حصہ بھی......

ناصر کاظمی کا یہ حکایاتی اور اساطیری مزاج، پہلی بارش، میں نکھر کر سامنے آیا ہے۔ "پہلی بارش" ایک ہی بحر کی غزلوں کا ایک سلسلہ (Series) ہے۔ جس میں ایک سفر کی روداد ہے سفر کے اظہار کے لئے ناصر نے تمثال آفرینی کا فن بھر پور طریقے سے برتا ہے۔

"پہلی بارش" کی پہلی غزل حمدیہ نوعیت کی ہے۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا!

اس کے بعد ایک ایسے سفر کی روداد ہے جس میں ملن بھی ہے اور جدائی بھی ،وصال اور ہجر، دونوں کیفیتوں کے بھر پور مناظر ہیں۔ یوں پہلی بارش کو ملن اور جدائی کی کہانی کہا جاسکتا ہے "منظر نامہ' کے حوالے سے "پہلی بارش" کا جائزہ لیں تو حمدیہ غزل کے بعد کی دس غزلیں ایک سلسلے کی کڑیاں بنتی منظر آتی ہیں' جن میں ایک ایسے سفر کی کہانی ہے جس میں شاعر اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کا ساتھی بھی ہے۔ اس سفر میں "سبز درخت"، "کچے گھر"، "لال کھجوریں"، "جنگل"، "ریت"، "پتھر کا شہر"، "وادی"، "شہر"، "صحرا"، "ریلوے اسٹیشن"، "گلیاں" ایسی علامتیں ہیں جو پھیل کر سابقہ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کی شناخت بنتی ہیں اس کے بعد گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں غزل خوف اور جادو کی امیجری سے بھر پور ہے۔

سناٹے میں جیسے کوئی دور سے آوازیں دیتا تھا
یادوں کی سیڑھی سے ناصر رات اک سایہ سا اترا تھا

دیکھ کے دو چلتے سایوں کو میں تو اچانک سہم گیا تھا
ایک کے دونوں پاؤں تھے غائب ایک کا پورا ہاتھ کٹا تھا
ایک کے الٹے پیر تھے لیکن وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا

زرد گھروں کی دیواروں کو کالے سانپوں نے گھیرا تھا
آگ کی محل سرا کے اندر سونے کا بازار کھلا تھا
اک جادوگرنی وہاں دیکھی اس کی شکل سے ڈر لگتا تھا
کالے منہ پر پیلا ٹیکا انگارے کی طرح جلتا تھا
پیاسی لال لہو سی آنکھیں رنگ لبوں کا زرد ہوا تھا
بازو کھنچ کر تیر بنے تھے جسم کماں کی طرح ہلتا تھا
ہڈی ہڈی صاف عیاں تھی پیٹ کمر سے آن ملا تھا

ان غزلوں میں اسرار، خوف اور جادو کی امیجری ہے جس کا سرچشمہ جادو کی رسمیں ہیں۔ چودھویں غزل میں بھی اس خوف کی ہلکی سی لہر موجود ہے...... پھر پندرھویں، سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں غزل ایسے مناظر کو ہمارے سامنے لے آتی ہے جن سے سابقہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا "لینڈ سکیپ" مرتب ہوتا ہے۔ ان مناظر میں "سمندر" "کشتی"، "ماہی گیر"، "چراغ"، "ساحل" اور اس قسم کی علامتیں اس خطے کے ساتھ مخصوص ہیں۔

نئے دیس کا رنگ نیا تھا دھرتی سے آکاش ملا تھا
دور کے دریاؤں کا سونا ہرے سمندر میں گرتا تھا

چلتی ندیاں، گاتے نوکے
نوکوں میں اک شہر بسا تھا
نوکے ہی میں رین بسیرا
نوکے ہی میں دن کٹتا تھا
مچھلی جال میں تڑپ رہی تھی
نوکا لہروں میں الجھا تھا
تیرے دھیان کی کشتی لے کر
میں نے دریا پار کیا تھا

چھوٹی رات، سفر لمبا تھا
میں اک بستی میں اترا تھا
سرما ندی کے گھاٹ پہ اس دن
جاڑے کا پہلا میلا تھا

اس کے بعد اس کی غزلیں مراجعت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ شاعر اس سفر سے لوٹ آیا ہے جو اس نے کسی کے ساتھ مل کر شروع کیا تھا مگر اُس کا ساتھی پہلے مناظر ہی سے اس سے جدا ہو گیا تھا باقی سفر اس نے تنہا طے کیا ہے۔ واپسی کا سفر اسے پھر اسی مقام پر لے آتا ہے جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا۔ یوں "پہلی بارش" کی غزلیں ایک دائرہ بنتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ "پہلی بارش" کی غزلوں میں حیرت کا عنصر ہے۔ "پہلی بارش" میں محبت کا تجربہ ضرور شامل ہے لیکن یہاں محبوب روایتی نہیں بلکہ محبت کا رشتہ عام انسانی رشتہ محسوس ہوتا ہے۔ اس سے کسی محبوب کا پیکر کم کم ہی ابھرتا ہے......

"پہلی بارش میں" غزل اور نظم کی ملی جلی سی کیفیت ہے اور اشعار میں تکمیل کا وہ حسن نظر نہیں آتا جو ناصر کی باقی غزلوں کا خاص انداز ہے مصرعے چست بھی کم ہیں، زبان ڈھیلی ہے اور یہ غزلیں اپنی تمام تر معنویت کے باوجود بیانیہ ہیں۔ تاہم ایک ہی بحر میں غزلوں کا ایک منفرد اظہاری تجربہ ہے۔ "پہلی بارش" کی فضا...... ماضی کی کسی کہانی

کہنے کا انداز لئے ہوئے ہے...... وہ انداز جو ناصر کے مزاج اور شخصیت کا حصہ ہے...... وہی حکایاتی اور اساطیری ذہن جو تصویروں سے کہانیاں تراش لیتا ہے......

"پہلی بارش" میں امیجری پر خاص زور دیا گیا ہے اور اس میں بڑے متنوّع رنگ ہیں۔ ذرا یہ رنگ ملاحظہ ہوں......

"چاند کی دھیمی ضو"

"سورج ننگے پاؤں کھڑا تھا"

"سبز درختوں کا رمنا"

"ایک طرف کچھ کچے گھر تھے، ایک طرف نالہ چلتا تھا"

"آنگن کی دیوار کا سایہ"

"لال کھجوروں کی چھتری"

"سبز کبوتر بول رہا تھا"

"ریت کا شہر اڑا جاتا تھا"

"سرخ چناروں کا جنگل"

"نیلی جھیل"

"پیڑ کے پیچھے پیڑ کھڑا تھا"

"بہتا چشمہ"

"ہلال سی انگلی"

"چرخ پر جب تارا ٹوٹا تھا"

"سانپ سنہرا"

"پتھر کی دیوار"

"اک رخسار پہ زلف گری تھی"

"ایک پاؤں میں پھول سی جوتی، ایک پاؤں سارا ننگا تھا"

"تیرے آگے شمع دھری تھی، شمع کے آگے اک سایہ تھا"

"سبز پہاڑی کا دامن"

"کوئی چراغ لئے پھرتا تھا"

"مرجھائے پھولوں کا گجرا"

"ایک کے الٹے پیر تھے لیکن، وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا"

"دیکھ کے دو چلتے سایوں کو، میں تو اچانک سہم گیا تھا"

"زرد گھروں کی دیواریں"

"پیاسی لال لہو سی آنکھیں"

"نئے دیس کا رنگ نیا تھا، دھرتی سے آکاش ملا تھا"

"دور کے دریاؤں کا سونا، ہرے سمندر میں گرتا تھا"

"چلتی ندیاں، گاتے نوکے، نوکوں میں اک شہر بسا تھا"

"مچھلی جال میں تڑپ رہی تھی"

"بارہ سکھیوں کا اک جھرمٹ"

"ہرے گلاس میں چاند کے ٹکڑے، لال صراحی میں سونا تھا"

"دیر کے بعد مرے آنگن میں سُرخ انار کا پھول کھلا تھا"

"ریل چلی تو ایک مسافر، مرے سامنے آبیٹھا تھا"

"شاخیں تھیں یا محرابیں تھیں، پتا پتا دست دعا تھا"

"پہلی بارش" کی فضا اور منظر نامہ نظم کا سا ہے، لیکن ہیئت غزل کی ہے۔ یوں غزل اور نظم کا ایک امتزاج ہے۔

> "پہلی بارش" میں غزل اور نظم کا امتیاز اٹھ گیا ہے۔ "من" اور "تو" کا وصال ہو گیا ہے۔ جدت اور تجدید ہم آغوش نظر آتے ہیں اور روایت اور وجدان کے امتزاج نے زبان کے شعور کے مختلف علاقوں کو ایک کر دیا ہے"۔(36)

ہاں "من" و "تو" کا وصال تو ہوا ہے لیکن سفر کے آخر میں پھر وہی جدائی اور تنہائی ہے جو ناصر کو زندگی بھر لاحق رہی اور جو انسان کا مقدر بھی ہے۔

تنہائی کے اس تجربے کو باصر سلطان کاظمی نے "پہلی بارش" کے تناظر میں ایک بڑا تخلیقی تجربہ قرار دیا ہے (بہ حوالہ دیباچہ "پہلی بارش" ساتویں اشاعت 1989ء) شعور و آگہی کا گہرا اور بامعنی تجربہ تنہائی میں ہی ممکن ہے۔ یہ اپنی دریافت کا وہ عمل ہے جس سے پہلے اپنے اور پھر کائنات کے راز افشا ہوتے ہیں۔ ناصر کے الفاظ میں تنہائی میں دل کی جنت ہے جو انسان کے اندر رہتی ہے لیکن انسان اسے دل سے باہر ڈھونڈتا ہے۔

"پہلی بارش" کے شعری تجربے کے معنویت کے حوالے سے کوئی قطعی بات کہنا دشوار ہے۔ غالب احمد (بہ حوالہ دیباچہ "پہلی بارش" پہلی اشاعت) باصر سلطان کاظمی (بہ حوالہ دیباچہ "پہلی بارش" ساتویں اشاعت) اور ڈاکٹر حسن رضوی (بہ حوالہ "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر") نے اپنے اپنے انداز میں اس شعری مجموعے کی معنوی جہتوں کی نقاب کشائی کی ہے اور ان تینوں کے نقطۂ نظر میں مماثلت نظر نہیں آتی۔ ایک نقطۂ نظر راقم کا بھی ہے کہ "پہلی بارش" کو لینڈ سکیپ کے حوالے سے دیکھا جائے جس کی تفصیل

پہلے بیان کی گئی ہے۔

اس امکان کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا کہ ناصر نے ''پہلی بارش'' میں اپنے زندگی کے دو یادگار سفر ایک منفرد انداز میں بیان کئے ہیں۔ ایک سفر ملتان سے کوئٹہ تک کا اور دوسرا مرحوم مشرقی پاکستان کا جو اس نے ملک کے دیگر ادیبوں' شاعروں کے ساتھ کیا تھا۔ ان کے سفر کوئٹہ کے حوالے سے احمد عقیل روبی نے جو اشارے کئے ہیں (بہ حوالہ ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'') وہ مکمل طور پر غلط قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ راقم کی ذاتی معلومات کے مطابق بھی ان میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ ان واقعات کو اور ''پہلی بارش'' کی دس بارہ غزلوں کو جو حمدیہ غزلوں کے بعد آتی ہیں...... ایک تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو ان کی معنویت کی ایک اور سطح سامنے آتی ہے۔ ان غزلوں میں پتھر کے جس شہر کا ذکر ہے، وہ کوئٹہ ہی ہے اور جو منظر نامہ پیش کیا گیا وہ اس شہر اور اس کے آس پاس کا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر اس جانب محض اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ ان غزلوں میں ذاتی واقعاتی صداقتوں کو اس اندامیں بیان کیا گیا ہے کہ ان میں عمومیت پیدا ہوگئی ہے۔

اس تناظر میں ممکن ہے، بعض لوگوں کو ''پہلی بارش'' میں کوئی بڑا معنوی اور شعری تجربہ محسوس نہ ہو، تاہم یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ناصر نے عام سے تجربوں کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ وہ ایک منفرد تجربہ بن گیا ہے۔ یہ غزلیں اپنے اندر بے پناہ تسلسل رکھتی ہیں اور ایک ایسی کہانی بیان کرتی ہیں جس سے ناصر کے منفرد تخلیقی تجربے کی عکاسی ہوتی ہے، خوبصورت امیجری نے بھی اس کے بیان کو بہت زیادہ دلآویز بنا دیا ہے اور اس کی معنوی جہتوں میں اضافہ کیا ہے۔

''پہلی بارش'' کی غزلیں اپنے موڈ اور میلان کے تناظر میں ناصر کاظمی کے دیگر دو

شعری مجموعوں ''برگِ نے'' اور ''دیوان'' سے مختلف ہیں۔ اس لئے ان کا علیحدہ جائزہ پیش کیا گیا ہے، تاہم جہاں تک ''برگِ نے'' اور ''دیوان'' کا تعلق ہے ان دونوں کے مزاج میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ ''برگِ نے'' کی غزلوں کا عمومی انداز اور لہجہ سادہ، دھیما اور بے ساختہ محسوس ہوتا ہے، سوائے چند غزلوں کے جہاں ناصر کا لہجہ قدرے خطابیہ اور بلند آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ''دیوان'' کی غزلیں قدرے بلند آہنگ لہجے سے عبارت ہیں۔ مزید غور کریں تو ''دیوان'' کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے کہ اس میں کسی ایک متعین لب و لہجے کی غزلیں نہیں ملتیں۔ کہیں لہجہ دھیما اور کہیں بلند آہنگ ہو جاتا ہے۔ بعض غزلیں غالب اور اقبال کے انداز میں بھی ملتی ہیں۔ ''دیوان'' کی زبان بھی ''برگِ نے'' سے مختلف ہے۔

''دیوان'' میں کسی ایک متعین لب و لہجے کی غزلوں کے فقدان کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان غزلوں کی ترتیب میں زمانی تسلسل کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ ''دیوان'' کا جو ایڈیشن 1993ء میں فضل حق اینڈ سنز نے شائع کیا ہے، اس میں اکثر غزلوں کے ساتھ ان کا سن تحریر بھی دیا گیا ہے اور غزلوں کی ترتیب میں زمانی تسلسل کا خیال نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اس میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جو ''برگِ نے'' کی اشاعت (1952ء) کے آس پاس لکھی گئی تھیں۔ کچھ ساٹھ کی دہائی کی اور کچھ ستر کی دہائی کی۔ ترتیب ایسی دی گئی کہ مثلاً ایک غزل 1954ء کی ہے تو اس سے آگے 1962ء کی، پھر اس کے بعد 1956ء کی اور پھر ساٹھ کی دہائی کی کوئی غزل آ گئی۔ اگر ترتیب میں زمانی تسلسل کا خیال رکھا جاتا تو ''دیوان'' کی غزلوں کے لہجے کے تعین میں آسانی پیدا ہو جاتی۔

''دیوان'' کی غزلوں میں ناصر نے زبان اور الفاظ کے کلاسیکل انداز سے قدرے ہٹ کر جدید ڈکشن اختیار کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن وہ اس تجربے میں

پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔ کسی قدر نیا طرزِ احساس بھی "دیوان" میں جھلکتا ہے تاہم میری ذاتی رائے میں "برگِ نے" زیادہ بہتر طور پر ناصر کے شعری مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ "برگِ نے" کی غزلیں دلوں کے تار چھیڑتی ہیں اور وہی ناصر کا اپنا منفرد انداز ہے۔ دیوان میں وہ کسی ایک متعین راستے پر نہیں چل سکا، جس کی وجہ سے دیوان مختلف ذہنی کیفیات اور مختلف فکری دھاروں کا مجموعہ نظر آتا ہے۔

ناصر کے حوالے سے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے ہاں فکر و فلسفے کی تلاش کارِ بے سود ہے۔ وہ شعر و ادب میں فکر و فلسفے کو سمونے کا اتنا قائل بھی نہیں ہے، لیکن بعض اوقات وہ اپنے اشعار میں فلسفہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں ناکام رہتا ہے۔ "دیوان" کی بعض غزلوں میں فکر و فلسفہ یا سیاسی و سماجی شعور کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، تاہم وہ محض پرچھائیاں ہیں۔ ان کے پیچھے شاعر کا کوئی گہرا داخلی تجربہ محسوس نہیں ہوتا۔

"برگِ نے" اور "دیوان" کے موازنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان میں کسی ایک کو کمتر ثابت کرنا مقصود ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ "برگِ نے" زیادہ بہتر طور پر ناصر کی نمائندہ ہے۔ "دیوان" کی بعض غزلیں بہت خوبصورت ہیں۔ چند بہت مقبول بھی ہیں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر گائی بھی جاتی ہیں۔ تاہم وہ ساری غزلیں مکمل طور پر اس کی نمائندہ غزلیں قرار نہیں دی جا سکتیں۔ ناصر کی غزل کا نمائندہ رنگ وہی ہے جسکی جانب خلیل الرحمٰن اعظمی نے اشارہ کیا ہے۔

> "ناصر کاظمی کی غزل بھی عجیب جادو رکھتی ہے، اس کی غزلیں پڑھتے ہوئے ردیف و قافیہ تو دور جا ٹھٹا ہے۔ ہر شعر میں ناصر کاظمی سامنے آجاتا ہے اور گلے میں باہیں ڈال کر اپنی بنائی ہوئی دنیا میں لے جاتا ہے...... یہاں

خموشی انگلیاں چٹخاتی ہے اور سونے صحرا آدھی راتوں کو چیخ
اٹھتے ہیں، یہاں کوئی صورت جو ستارہ، شبنم اور پھول کی
طرح ہے، اپنی طرف بلاتی ہے۔ یہاں جلتی ہوئی ریت
پاؤں چلنے لگتی ہے۔ یہاں دھیان کی سیڑھیوں پر کوئی
پچھلے پہر چپکے سے پاؤں دھرتا ہے۔ کبھی صبح کا سماں ہوتا
ہے اور کبھی پتیاں محوِ یاس اور گھاس اداس ہوتی ہے......
غرض یہ "شہرِ غزل" ایک عجیب شہر ہے"۔(37)

ہاں یہ "شہرِ غزل" بڑا ہی عجیب و غریب شہر ہے، یہاں ناصر کی اداسیاں بولتی ہیں، تنہائیاں ہم سے محو کلام ہوتی ہیں اور اس کے رت جگے ہمیں اپنے لگتے ہیں۔ ناصر کی غزلیں پڑھ کر اگر یہ سوال ابھرتے ہیں کہ ناصر اداس اور تنہا کیوں تھا؟ اور وہ نیند کے ساحلوں سے دور رت جگوں کا خوگر کیوں تھا؟...... تو شاید اس کے رت جگے رائیگاں نہیں گئے...... ناصر کی یہ غزلیں دکھ کی آواز ہیں...... ممکن ہے اس آواز کے پہلو میں ہم میں سے کسی کے دکھ کی آواز بھی شامل ہو جائے اور ناصر کی یہ شکایت ختم ہو جائے۔

نالۂ آخرِ شب کس کو سناؤں ناصر
نیند پیاری ہے مرے دیس کے فنکاروں کو

ناصر تو نالۂ آخرِ شب سنا چکا اور سنانے کے بعد اس نے ہمیشہ کیلئے چپ سادھ لی، لیکن اسکی غزل تو اب بھی اس اعتماد کے ساتھ زندہ ہے جس اعتماد کے ساتھ خود ناصر نے کہا تھا۔

ڈھونڈیں گے لوگ۔ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا!

حوالہ جات

1- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' غزل اور متغزلین' ص255

2- فتح محمد ملک' تعصبات' ص158

3- ڈاکٹر عبادت بریلوی' "نظم کی ضرورت" اوراق' (جدید نظم نمبر) ص510

4- ناصر کاظمی' "آخری گفتگو" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص199-200

5- ڈاکٹر عبادت بریلوی' "اردو غزل کے جدید رجحانات" ماحول' شمارہ 7-8' ص29

6- ناصر کاظمی' "ہنائے تازہ' جان پہچان' میر تقی میر" سویرا' شمارہ 19-20' ص261

7- ناصر کاظمی' "میرا ہم عصر" ادبِ لطیف' نومبر 1962ء' ص7

8- سجاد باقر رضوی' "بگلے کی پیغمبری" لفظ' جنوری 1974ء' ص19

9- جیلانی کامران' "زندہ ناصر کاظمی" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص137

10- انتظار حسین' "آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے" نقوش' مئی 1952ء' ص171

11- ایضاً

12- انتظار حسین' "چار گھڑی یاروں کا میلہ" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص34

13- سلیم احمد' "نئی دنیا کا مسافر" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص94

14- انتظار حسین' حوالہ فتح محمد ملک' تعصبات' ص158-159

15- ناصر کاظمی' "اعتبارِ نغمہ" دیباچہ برگِ نَے' ص5-6

16- شاہین' "صنعتی تہذیب اور جدید ادب" فنون' اگست' ستمبر 1972ء' ص31

17- سلیم احمد' "نئی دنیا کا مسافر" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص97-98

18- ناصر کاظمی' "میرا ہم عصر" ادبِ لطیف' نومبر 1962ء' ص7

-19 سجاد باقر رضوی' "بگلے کی پیغمبری" لفظ' جنوری 1974ء' ص 17

-20 سہیل احمد خان' "سرسوں کے پھول کا ہم عصر" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص 186

-21 ڈاکٹر وزیر آغا' "کچھ ناصر کاظمی کے بارے میں" تنقید اور مجلسی تنقید' ص 173

-22 سجاد باقر رضوی' "تنہائی کا سفر" راوی' اپریل 1972ء' ص 20

-23 ناصر کاظمی' "آخری گفتگو" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص 203-204

-24 شمس الرحمان فاروقی' "ناصر کاظمی' برگ نے" کے بعد "احمد مشتاق ہجر کی رات کا ستارا' ص 167

-25 ناصر کاظمی' "جان پہچان' میر تقی میر" سویرا' شمارہ 19-20-21' ص 271

-26 ناصر کاظمی' "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" ماہ نو' ستمبر 1954ء' ص 24

-27 ناصر کاظمی' "جان پہچان' میر تقی میر" سویرا' شمارہ 19-20-21' ص 262

-28 جابر علی سید' جدید نظم' جدید غزل اور جدید طرزِ احساس "فنون (جدید غزل نمبر) ص 222

-29 آغا سہیل' "جدید اردو غزل کی دروں بینی" فنون (جدید غزل نمبر) ص 260

-30 شمس الرحمٰن فاروقی' "ناصر کاظمی برگِ نے کے بعد" احمد مشتاق' ہجر کی رات کا ستارا' ص 161

-31 ایضاً

-32 ڈاکٹر عبادت بریلوی' "غزل اور مطالعہ غزل" ص 612-613

-33 جیلانی کامران' "زندہ ناصر کاظمی" احمد مشتاق ہجر کی رات کا ستارا' ص 138-139

-34 ناہید قاسمی' "ناصر کاظمی: شخصیت اور فن" ص 163

-35 ڈاکٹر عبادت بریلوی' "ناصر کاظمی اور برگِ نے" جدید شاعری' ص 512

-36 غالب احمد' "عرضِ سخن" دیباچہ' پہلی بارش' (پہلا ایڈیشن) ص 13

-37 خلیل الرحمان اعظمی' زاویۂ نگاہ' ص 73-74

باب چہارم

ناصر کاظمی کی نظمیں اور نثری سرمایہ

نظم

اردو غزل ہمیشہ ایک مقبول صنفِ سخن رہی ہے، اور اس کے نام لیوا ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ اردو غزل کے بارے میں کلیم الدین احمد نے کہا تھا کہ "اردو غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے" ناصر کاظمی کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کا بیشتر وقت غزل کی "وحشتوں" کی نازبرداری میں گزرا تاہم اس نے نظم گوئی بھی کی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ راستہ ناصر نے شعوری طور پر اختیار کیا۔

"یار کبھی کبھی تو چاند بھی مجھے پیاز کا پرت نظر آتا ہے۔
میں دھیان کی انگلیوں سے راتوں اس کے پرت اتارتا رہا
لیکن یہ چاند کا پیاز ختم ہونے میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی پیاز
کی گٹھی کو دیکھ کر یوں گمان گزرتا ہے جیسے چاند اتر آیا،
غزل گوئی میں خرابی یہی ہے کہ وہاں پیاز کا ذکر نہیں کیا جا
سکتا۔ ویسے یہ کام اب کرنا ہی پڑے گا۔" (1)

اور شاید اسی "کام" کے سرانجام دینے کے پیش نظر اس نے نظم گوئی کا راستہ بھی اختیار کیا لیکن اس کی نظموں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ اس راستے کا مسافر نہیں تھا۔ اس کی صلاحیت غزل میں ہی نکھر کر سامنے آتی ہے۔ نظموں

میں وہ رنگ، انداز اور تجربہ نظر نہیں آتا جو اس کی غزلوں کی شان ہے اور اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ نظم دراصل مربوط اظہارِ خیال کا تقاضا کرتی ہے، اس کے لیے جزئیات اور تفصیلات ناگزیر ہیں...... جب کہ ناصر کے ہاں وضاحت، ترتیب اور تفصیلات کم کم نظر آتی ہیں۔ اسے مختصر لیکن مکمل جملوں کا شوق ہے اور یہی شوق اس کے شعروں میں تکمیل کا حسن (Beauty of Perfection) پیدا کرتا ہے اس کے ہاں جو ایمائیت اور اشاریت نظر آتی ہے وہ غزل کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

نظم میں جیسا کہ پہلے کہا گیا، موضوع اور تجربے کی نوعیت واضح ہونی چاہئیے۔ غیر واضح اور مبہم تجربات خواہ وہ کتنے ہی بامعنی ہوں' نظموں میں بیان کرنا دشوار ہوتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے پاس ایک شاعرانہ نظر تھی جس سے اس نے اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کیا۔ مثلاً اس نے ہجرت کے تجربے، جلے ہوئے مکانوں اور اجڑے قافلوں کو نظریات کی عینک سے نہیں محض احساس اور تخیل کی سطح پر محسوس کیا اور اس کا بہتر اظہار غزل میں ہی ممکن تھا۔ اس وجہ سے اگر اس نے نظمیں تحریر بھی کیں تو وہ معیار کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچ سکیں۔

خود ناصر کی شخصیت ایک خاص وضع کی تھی۔ جس میں نامرادی اور محرومی کا عنصر کچھ زیادہ ہی تھا، یہ عنصر ان کے ہاں اس وقت پیدا ہوا جب آئیڈیل اور حقیقت کا تصادم ہوا۔ وہ آئیڈیل جو ان کے اپنے تھے اور وہ حقیقت جو ان سے متعلق ہوتے ہوئے بھی شب و روز کی زندگی سے پھوٹی تھی۔ وہ پھیلنا ضرور چاہتے تھے لیکن سمٹنے پر مجبور تھے، اداسی، تلون اور شدید احساس تنہائی انہیں پھیلنے نہیں دیتا تھا۔ ان کے پاس اس قسم کا کوئی اصول بھی نہیں تھا کہ وہ شخصیت میں ربط و تنظیم پیدا کر لیتے، انہیں کوئی فلسفۂ زیست بھی نہیں ملا تھا، اور اگر ان کے پاس کچھ تھا تو چند عقائد کا آسرا تھا لیکن ستم تو یہی ہوا کہ یہ

آسرا بکھری اور ٹوٹی شخصیت کو جوڑنے کی بجائے جذباتی سطح پر کچھ اور منتشر کر دینے کا باعث بن گیا۔ ناصر کی شخصیت ایک غیر منظّم رومانی شخصیت ہے جو معاشرے سے کٹی ہوئی ہے اور اس کی وجہ وہی ہجرت کا تجربہ ہے جس نے سب کچھ دھندلا دیا تھا۔ ناصر کے لئے یہی دھند ایک بہت بڑا تجربہ بنی۔ اس دھند میں چہرے واضح نہ ہو سکے، منظر کے باطن نہ دکھائی دیئے اور نہ اسرار سے پردے اٹھ سکے...... بس کچھ غیر واضح رنگ تھے اور چند مبہم سے خاکے تھے جن پر جلے ہوئے مکانوں کی دھول پڑ گئی تھی......یوں وضاحتوں کی گنجائش ہی پیدا نہ ہو سکی، جزئیات اور تفصیلات کے مواقع میسر نہ تھے، پھر ناصر کا رومانی مزاج تھا جو وضاحتوں سے گریزاں تھا...... یہی وجہ ہوئی کہ ناصر نظم گوئی میں کمال پیدا نہ کر سکے۔ ان کے ہاں وضاحت سے زیادہ تاثر ہے۔ ان کے ہاں الفاظ معانی کے ابلاغ کا ذریعہ نہیں بنتے بلکہ معانی کو تصاویر اور اصوات کے وسیلے سے محسوس کیا جاتا ہے۔ رات کا سکوت، دھندلی اور خاموش فضا میں حرکت کرتے ہوئے پراسرار سائے، اور کچھ پردوں کی اوٹ میں مبہم سے مناظر جو ناصر کے شعری مزاج کو سمجھنے کیلئے ایک اشارہ بنتے ہیں، نظموں کے ذریعے اظہار نہیں پا سکتے۔ کیوں کہ ان میں وضاحت اور تفصیل نہیں۔ تاہم اس بنیادی حقیقت کے باوجود کہ ناصر کا مزاج ہی غزل کا مزاج تھا......اس نے نظمیں کہیں۔ جو "نشاطِ خواب(2)" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ ان نظموں کے علاوہ ناصر نے "سر کی چھایا" کے نام سے ایک طویل منظوم کتھا بھی لکھی ہے۔

"نشاطِ خواب" میں اصناف اور مزاج کے نقطۂ نظر سے نو نظمیں، چھ نعتیں، پندرہ جنگی اور قومی ترانے ہیں اور دو نظمیں قائداعظم کے لیئے مخصوص ہیں۔

"نشاطِ خواب" کے نام سے جو نظم اس کتاب میں ہے، قدیم داستانوی اثرات رکھتی ہے جس کے "مطلعِ اوّل" کی ذیل میں ناصر کاظمی نے تمثال آفرینی (Imagery)

پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ شروع میں اسرار اور خوف کی امیجری سے ایک خاص رنگ پیدا کیا گیا ہے۔

قصہ ہے اس کے شہر کا یارو شنیدنی ہر کوچہ اک طلسم تھا ہر شکل موہنی
اب تک ہے یاد اسکی جگا جوت روشنی تھا اک عجیب شہر درختوں کی اوٹ میں
رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی سچ مچ کا اک مکان پرستاں کہیں جیسے
دیواریں سنگِ سرخ کی، دروازے چندنی اونچی کھلی فصیلیں، فصیلوں پہ برجیاں

مکان کے محل وقوع، ساخت اور اس کے دیگر تعمیراتی حسن کی وضاحت کے بعد شاعر ایک اور منظر پیش کرتا ہے۔

دیکھی تھی میں نے دور سے بس اس کی روشنی کل رات اس پری کی عروسی کا جشن تھا

اور پھر اس جشنِ عروسی کی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے انبوہ میں جس شے نے شاعر کو چونکا دیا، وہ ایک اور منظر کی جانب اشارہ کرتی ہے:

پھرتی تھی ساتھ ساتھ لگی جس کے چاندنی اتنے میں ایک کفر سراپا نظر پڑا
ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں، شانوں پہ سوزنی ماتھے پہ چاند، کانوں میں نیلم کی بالیاں
پتلی ہر ایک آنکھ کی ہیرے کی تھی کنی پلکیں دراز خط شعاعی سی تیز تیز

اس کفر سراپا کے خدوخال کی وضاحت شاعر نے بڑی تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ اور آخر میں یہ کہہ کر کہانی ختم کر دی ہے:

نیند آگئی مجھے کہ وہاں چھاؤں تھی گھنی تارا سحر کا نکلا، تو ٹھنڈی ہوا چلی

بنیادی طور پر نظم کا یہ حصہ "حسن کی ایک کہانی" ہے جس کے اظہار کے لئے ناصر نے تمثالوں کے صرفِ کثیر سے کام لیا ہے۔ صرف تین اشعار ایسے قرار دیئے جا سکتے ہیں جن میں امیجری نہیں ہے، ورنہ نظم کے اس حصے کا ہر شعر کسی نہ کسی امیج کو

سامنے لاتا ہے...... ویسے یہ تین اشعار تمثالوں کے اس ہجوم سے الگ نہیں ہیں بلکہ اس کے کسی نہ کسی گوشے کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں۔

صورت نظر نواز' طبیعت ادا شناس سو حسن ظاہری تو کئی وصف باطنی

پردے اٹھا دیئے تھے نگاہوں نے سب مگر دل کو رہا ہے شکوۂ کوتاہ دامنی

منظر مجھے ہوس نے دکھائے بہت مگر ٹھہرا نہ دل میں حسن کا رنگِ شکستنی

"مطلع ثانی" کی ذیل میں آنے والے اشعار میں ناصر کاظمی نے اپنے آباؤ اجداد کی عظمتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

دل کھینچتی ہے منزلِ آبائے رفتنی جو اس پہ مر مٹے وہی قسمت کے تھے دھنی

وہ شیر سو رہے ہیں وہاں کاظمین کے ہیبت سے جن کی گرد ہوئے کوہ آہنی

شاہانِ فقر وہ مرے اجداد باکمال کرتی ہے جن کی خاک بھی محتاج کو غنی

اور

اس آستاں کی خاک اگر ضوفشاں نہ ہو برجوں سے آسمان کے اڑ جائے روشنی

نظم کے اس حصے کا لہجہ پہلے حصے کی نسبت بلند تر ہے۔ پہلے حصے میں شاعر صرف ایک کہانی سنا رہا ہے جب کہ اس حصے میں وہ کچھ باتوں کو ذہنوں میں راسخ کرانا چاہتا ہے، جو اس کی مخصوص عقیدتوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس لئے یہاں بات بات پر زور ہے۔ اس حصے میں تمثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور شاعر نے زیادہ سے زیادہ ابلاغ کے نقطۂ نظر سے بات سیدھے سادے انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس نظم کے آخری حصے میں شاعر نے قطعے کا نشان دے کر اپنے وطن مالوف (انبالے) اور اپنی شخصیت اور فن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے:

انبالہ ایک شہر تھا' سنتے ہیں اب بھی ہے'
میں ہوں اس لٹے ہوئے قریے کی روشنی

اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا!
لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ معدنی

جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی
روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی

خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں
میرے خمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی

اور

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آب دار
اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی

ہر لفظ ایک شخص ہے' ہر مصرع آدمی
دیکھو مری غزل میں مرے دل کی روشنی!

اس نظم کی معنویت بظاہر سہ پہلو ہے جو ظاہری طور پر نظم کو تین حصوں میں تقسیم کرتی ہے، تاہم مجموعی تاثر کے لحاظ سے یہ تینوں حصے باہم مربوط ہیں، اور ان میں ناصر نے اپنے وطن مالوف انبالہ، اپنے آباؤ اجداد کی عظمت اور انہی پہلوؤں کی تفصیل بیان کی ہے اس لحاظ سے یہ نظم ناصر کی اپنی کہانی بیان کرتی ہے۔ اس نظم میں امیجری کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔

"شہرِ غریب" "نشاطِ خواب" کے مقابلے میں زیاد خوبصورت نظم ہے۔ اس میں شاعرانہ حسن کے علاوہ قافیے کی وہ سنگینی اور سنگلاخی بھی نہیں جو "نشاطِ خواب" میں "چشیدنی" "شکستنی" "راج ہنسی" "کنچنی" "سنکھ سنکھنی" اور "سوزنی" جیسے قافیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ "شہرِ غریب" دراصل محبوب اور اس کے مکان کی تلاش کا منظر نامہ ہے' جس میں خوف کی امیجری غالب ہے۔ اسرار میں ڈوبی ہوئی آوازیں، بے اماں اجاڑ مکان، مزاروں کے سلسلے، پاؤں کی چاپ اور سناٹے اور سنسان راتوں میں در د دیوار کے سایوں پر سانپ کے دھوکے...... وہ منظر ہیں جن کے ذریعے ناصر کاظمی نے اس تلاش کی معنویت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے...... خوف اور اسرار کی فضا شروع سے آخر تک ہے۔

رات سنسان، آدمی نہ دیا کس سے پوچھوں تری گلی کا پتا

شہر میں بے شمار رستے ہیں کیا خبر تو کدھر گیا ہو گا!

آ رہی ہے یہ کس کے پاؤں کی چاپ پھیلتا جا رہا ہے سناٹا!

سامنے گھورتی ہیں دو آنکھیں اور پیچھے لگی ہے کوئی بلا

اک طرف بے اماں اجاڑ مکاں اک طرف سلسلہ مزاروں کا

سرنگوں چھتریاں کھجوروں کی بال کھولے کھڑی ہو جیسے قضا

اس خوف اور ان جانے اسرار کے ہجوم میں شاعر کو ایک مکان دکھائی دیتا ہے جو لامحالہ محبوب ہی کا مکان ہے لیکن شاعر کا دل وہم اور تذبذب کا اسیر ہے۔۔۔ دستک کے لئے اس کے ہاتھ بڑھتے ہیں لیکن پھر رک جاتے ہیں۔

یہ دیا سا ہے کیا اندھیرے میں ہو نہ ہو یہ مکان ہے تیرا

دل تو کہتا ہے در پہ دستک دوں سوچتا ہوں کہ تو کہے گا کیا

جانے کیوں میں نے ہاتھ روک لئے یہ مجھے کس خیال نے گھیرا

اور پھر خوف در خوف اور اسرار در اسرار کا ایک طویل سلسلہ ہے جو شاعر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ہر شے خوف اور اسرار کی دھند میں گھری ہوئی ہے۔

دشتِ شب میں ابھر کے ڈوب گئی کسی ناگن کی ہولناک صدا

تیرے دیوار و در کے سایوں پر مجھ کو ہوتا ہے سانپ کا دھوکا

بوٹا بوٹا ہے سانپ کی تصویر پتا پتا ہے سانپ کا ٹیکا!

آ رہی ہے لکیر سانپوں کی! ہر گلی پر ہے سانپ کا پہرا

سانپ ہی سانپ ہیں جدھر دیکھو شہر تیرا تو گڑھ ہے سانپوں کا

تیرے گھر کی طرف سے میری طرف بڑھتا آتا ہے ایک سایا سا

رات گئے کا یہ منظر جس میں ہر طرف خوف، تجسّس اور اسرار پھیلا ہوا ہے، شاعر کے ذہن پر اس طور محیط ہے کہ وہ محبوب کے دروازے پر دستک بھی نہ دے سکا، اسے بے نام سے واہموں نے آلیا، لیکن اس خوف نے بھی اس کے شوقِ دید کو کم نہیں کیا، وہ ہراساں تو ضرور ہے لیکن پُر امید ہے۔ شاید اس خوف نے ابھی اس کی گویائی نہیں چھینی۔

ارے یہ میں ہوں تیرا شہر غریب　　تو گلی میں تو آ کے دیکھ ذرا
سوچتا ہوں کھڑا اندھیرے میں　　تو نے دروازہ کیوں نہیں کھولا

اور پھر یوں لگتا ہے جیسے شاعر نہ دستک دے سکا اور نہ اس کی گویائی نے کچھ کام کیا۔ اس کی نامرادی خود بول اٹھی ہے۔

یہاں پھلتا نہیں کوئی آنسو　　یہاں جلتا نہیں کسی کا دیا
تیرا کیا کام تھا یہاں ناصر　　تو بھلا اس نگر میں کیوں آیا

یہ نظم ایک سوال سے شروع ہوتی ہے اور ایک سوال پر ختم ہوتی ہے۔ نارسائی کا رنگ جو شروع میں ہے، وہی آخر میں ہے۔ اس سفر میں اس قدر خوف اور اسرار ہے کہ کچھ واضح طور پر دکھائی نہیں دیتا۔ اور اگر کچھ دکھائی بھی دیا ہے تو وہ وہم و گمان کی چادر میں لپٹا ہوا...... جسے شاعر چھو بھی نہ سکا اور محرومی کا کرب آخر میں ایک درد انگیز سوال بن کر رہ گیا ہے...... ایک ایسا سوال جو آغاز سفر میں بھی تھا اور انجامِ سفر پر بھی ہے۔ رات گئے کے سفر ناصر کو ویسے بھی حد درجہ عزیز ہیں، رات اس کے ہاں تلاش کا استعارہ ہے جو اس نظم میں اپنی ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔ ناصر کے فن کا ایک اہم وسیلہ امیجری ہے جو اس نظم میں بھی قدم قدم پر موجود ہے...... قدم قدم پر التباسِ نظر ہے جس نے خوف اور وہم کی امیجری کو جنم دیا ہے اور جو نظم کی پوری فضا پر حاوی ہے۔ جو کچھ ہے اس

فضا کے اندر ہے لیکن وہاں تک کون جائے؟ شاعر بھی تو تھک ہار کر مایوس و نامراد لوٹ آیا۔

"نیا سفر" جس کے نیچے جولائی 1954ء کی تاریخ درج ہے۔ غالباً اس زمانے کی نظم ہے جب ناصر کاظمی نے انتظار حسین وغیرہ کے ساتھ مل کر "نئی نسل" کا اعلان کیا تھا۔ اور جس کے بارے میں انتظار حسین لکھتے ہیں۔

"پاکستان کی ادبی تاریخ میں یہ پہلا اعلانِ بغاوت تھا۔ اصل میں ہم باقی ادیبوں سے الگ ایک اور سطح پر جی رہے تھے۔" (3)

نظم کی مجموعی فضا بندی میں اسی نوع کا رنگ غالب ہے کہ پرانے وجود سے ایک نیا پیکر ابھر رہا ہے۔ نئی منزلیں، نئے کارواں، نئے گیت اور نئے راگ جو اس نئے سفر کی علامت ہیں، نظم کے آغاز میں ہی خود بول اٹھتے ہیں۔

اندھیروں کی نگری سے پھوٹی کرن مہکنے لگا خاک دانِ کہن
اٹھا محملِ وقت کا سارباں نئی منزلوں کو چلے کارواں
سریلی ہواؤں نے چھیڑا وہ راگ لگی اوس سے خیمۂ گل میں آگ
نئے پھول نکلے' نئے روپ میں زمیں جھم جھمانے لگی دھوپ میں

نئی فضاؤں' نئے پھولوں اور نئی منزلوں کے تذکرے کے بعد نظم ایک اور فضا میں داخل ہو جاتی ہے' یہ فضا پہلی فضا سے مختلف ہے۔ یہاں امید کی فضا پھر اندھیروں میں ڈوبتی نظر آتی ہے۔ اس فضا کو اگر ہجرت کے واقعے کی مناسبت سے دیکھا جائے تو اس کی معنویت کچھ واضح ہوتی ہے۔ بالخصوص ان اشعار سے تو اس جانب خاصا واضح اشارہ ملتا ہے۔

زمین ہٹ گئی، آسماں ہٹ گیا چمن ہٹ گیا، آشیاں ہٹ گیا

پہاڑوں میں میداں میں، جنگل میں آگ سمندر میں، خشکی میں، جل تھل میں آگ

گرجنے لگیں آگ کی بدلیاں! جھلسنے لگیں پیاس سے کھیتیاں

اور کہیں یہ ہجرت کے اس پار رونقوں کا نوحہ تو نہیں؟

چمن در چمن وہ رمق اب کہاں

وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں

کراں تا کراں ظلمتیں چھا گئیں

وہ جلوے طبق در طبق اب کہاں

بجھی آتشِ گل، اندھیرا ہوا

وہ اجلے سنہرے ورق اب کہاں

یہ داستان خاصی طولانی ہے، جس میں شعر و ادب میں جمود کی صورت حال کے بعد ایک نئے عہد کی بشارت دیتے ہوئے ناصر کاظمی نے یہ کہانی ختم کر دی ہے۔ دنیائے ادب میں تیرہ شبی کچھ اس طور کی ہے۔

نہ چشمِ بصیرت نہ ذوقِ ہنر ہوئیں ساری اقدار زیر و زبر

یہاں میر و غالب کا فن کیا کرے سخن ساز عرضِ سخن کیا کرے

اور تیرہ شبی سے ایک نیا عہد اس رنگ میں طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔

بدلنے لگی آسمانوں کی لَے نیا چاند اترا سرِ برگِ نے

ستارے گئے ظلمتوں کو لئے چٹخنے لگے شاخچوں پر دیئے

اور

نئی رت نے چھیڑا نیا ارغنوں فضا میں جھلکتا ہے لمحوں کا خوں
ہوئے نغمہ زن طائرانِ چمن کہ عرصے میں اترے ہیں اہلِ سخن
وہ درویشِ گل گوں قبا آگئے وہ رندانِ خونیں نوا آگئے
نئے دن کا سورج دمکنے لگا زمیں کا ستارہ چمکنے لگا

یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں ایک رواں دواں نظم ہے جس کے ذریعے شاعر نے ایک مسلسل کہانی بیان کی ہے۔ یہاں "اندھیروں کی نگری" "قلزمِ ماہ" "پرانی حویلی کی دیوار" "دھوئیں کی لکیر" "سفینوں پہ اڑتے ہوئے بادباں" "رمیدہ غزل" "پھول سی تتلیاں" اور دھان کی کھیتیاں، جیسی تمثالیں بھی ہیں جو نظم کے مختلف مناظر کی تشکیل کرتی ہیں لیکن اس نظم میں گزشتہ دو نظموں کی طرح امیجری غالب نہیں ہے۔ نظم کا مجموعی لہجہ ناصر کے عمومی لہجے سے یعنی دھیمے لہجے سے مختلف ہے۔ چونکہ ایک نئے عہد کی بشارت مقصود ہے اس لئے اس نے قدرے بلند اور پُر عزم لہجے کے وسیلے سے اظہار کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ کہیں کہیں نظم میں اقبال کی نظم "ساقی نامہ" کی فضا بھی جھلکنے لگتی ہے۔

"بارش کی دعا" ایک سیدھی سادی نظم ہے جس میں خشک سالی کے عذاب سے تنگ آکر نہایت عاجزی کے ساتھ شاعر نے بارش کے لئیے دعا کی ہے۔ لہجہ التجا کا، اور تذکرہ اپنی بے چارگی کا......

اے داتا بادل برسا دے فصلوں کے پرچم لہرا دے
دیس کی دولت دیس کے پیارے سوکھ رہے ہیں کھیت ہمارے
ان کھیتوں کی پیاس بجھا دے اے داتا بادل برسا دے

استاد امانت علی خان مرحوم نے "انشا جی اٹھو اب کوچ کرو" گائی تو شاعر اور

گلوکار کی صداقتیں یک جا ہو کر امر ہو گئیں، کچھ یہی معاملہ اس نظم کا بھی ہے۔ یہ نظم جن دنوں کی ہے، وہ دن واقعی خشک سالی کے تھے، اسے ناصر کاظمی نے لکھا اور استاد امانت علی خان نے دو نفل ادا کرنے کے بعد ملہار کے سروں میں ریڈیو کے لئے گایا تو...... واقعی بارش شروع ہو گئی۔ (4)

"گجر پھولوں کے" اور "ساتواں رنگ" دو مختصر سی نظمیں ہیں۔ دو چھوٹے چھوٹے مناظر کو شاعر کی نظر نے دیکھا ہے اور محفوظ کر لیا ہے۔۔۔۔ اس کے بعد "گیت" "جاڑے کی رات" اور "پی، فو، جن" کے نام سے ناصر کاظمی نے چینی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ "گیت" میں کسی کے اکیلے پن کا تذکرہ ہے۔

اس کا دریچہ پانی پر کھلتا تھا
کاٹھ کے پل کے آمنے سامنے
وہاں وہ ننھی منی سندری!
سدا اکیلی رہتی تھی
اور اس کا کوئی یار نہ تھا

"جاڑے کی رات" کا انداز کچھ یوں ہے۔

مرا بستر کیسا سونا ہے
میں راتوں جاگتا رہتا ہوں
میں سوچتا ہوں کبھی یہ لہریں
ترے پاس مجھے پھر لے جائیں

اور اس طرح "پی، فو، جن" کی دو لائینیں ملاحظہ ہوں۔

اس سندری کے دھیان میں بیٹھے

میں اپنے دکھیارے من کی کیسے دھیر بندھاؤں

اس نظموں کے مجموعی مزاج کا جائزہ لیں تو واضح طور پر اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ناصر نے ایسی نظموں کا انتخاب کیا ہے جو اسکے اپنے مزاج سے میل کھاتی ہیں۔ یعنی وہی تنہائی، دکھ، فراق اور رت جگے جو ناصر کی شاعری کا مزاج بنتے ہیں' ان نظموں میں بھی ملتے ہیں۔

"نشاطِ خواب" کی چھ نعتوں میں ناصر کاظمی نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی عقیدت کا بہت زیادہ اظہار کیا ہے۔ نعتوں کے نیچے لکھی ہوئی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نعتیں ناصر نے اس زمانے میں لکھی ہیں جب وہ ریڈیو میں ملازم تھے اور اس کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے انہوں نے یہ نعتیں لکھیں۔۔۔۔ ان نعتوں کی فنّی قدر و قیمت سے قطع نظر ان میں عمومی باتیں ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ سیرت پاک ﷺ سے زیادہ معجزاتِ پاک نے شاعر کو متاثر کیا ہے۔ اس کی نظر عقیدت سے زیر بار ہے اور نہایت سادہ سے انداز میں اس نے اپنی عقیدتوں کا اظہار کیا ہے۔ البتہ غالب کے اشعار پر تضمین کرتے ہوئے، ناصر کی نعت اس کی دیگر نعتوں کی نسبت زیادہ خوبصورت اور بلند پایہ محسوس ہوتی ہے۔

یہ کون طائرِ سدرہ سے ہم کلام آیا

جہانِ خاک کو پھر عرش کا سلام آیا

جبیں بھی سجدہ طلب ہے یہ کیا مقام آیا

"زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لیئے"

کہاں وہ پیکرِ نوری، کہاں قبائے غزل
کہاں وہ عرش مکیں، اور کہاں نوائے غزل
کہاں وہ جلوۂ معنی، کہاں ردائے غزل
"بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگ نائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیئے"

اور

تھکی ہے فکرِ رسا اور مدح باقی ہے
قلم ہے آبلہ پا اور مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا اور مدح باقی ہے
"ورق تمام ہوا! اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیئے"

قائداعظم کے لیے ناصر کاظمی نے دو نظمیں کہی ہیں۔ ایک "آج تری یادوں کا دن ہے" اور دوسری "قائداعظم" ان میں سے پہلی نظم 11 ستمبر 1969ء کو لاہور ٹی وی سے نشر ہوئی۔ اس دونوں نظموں میں عمومی سے انداز میں ناصر نے قائداعظم کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ قائداعظم کے ساتھ ناصر کی عقیدت کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

"کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ میں ان ننھے حقیر
لوگوں میں سے ہوں جس نے قائداعظم محمد علی جناح
سے ایک مرتبہ ہاتھ ملایا اور وہ ہاتھ میں نے ابھی تک کسی
سے نہیں ملایا۔" (5)

اور اسی پہلو کا ایک رنگ یہ بھی ہے!

عزم ترا کہسار کی عظمت
تیری فکر سمندر گہرا!
دو دھاری تلوار کی ضربت
لمبا قد اور جسم اکہرا

(آج تیری یادوں کا دن ہے)

"قائداعظمؒ" کے عنوان سے جو نظم ناصر نے کہی اس میں ناصر نے قائداعظم کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی ہے۔ کچھ خوابوں کے تشنہ رہ جانے کی ایک طویل داستان جو ناصر کی اداسیوں کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب تھی۔۔۔ اس ایک شعر میں نظر آتی ہے۔

تزئینِ باغ تشنۂ تکمیل ہے ابھی
میرے وطن کو تیری ضرورت ہے آج بھی

ملی محرومیوں اور کچھ اسی قسم کی تشنہ کامیوں کی یہ داستان شو... مرحوم نے بھی کہی تھی کہ۔

دو لخت ہو چکا ہے میرا ملک دوستو
لاؤ کہیں سے قائد اعظم کو ڈھونڈ کر

تاہم ناصر کا اظہار زیادہ شاعرانہ ہے۔

ستمبر 1965ء کی جنگ ہماری قومی تاریخ میں کئی حوالوں سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس جنگ میں جہاں ہمارے جیالوں نے خون کی دیوار کھڑی کر کے ارضِ پاک کا تحفظ کیا وہاں ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنے محاذ پر یہ فرض ادا کیا۔ اس جذبے کے

اسیر ہو کر بے شمار جنگی اور قومی ترانے لکھے گئے، اور ان میں سے بہت سے ترانے حد درجہ مقبول بھی ہوئے ...... ناصر کاظمی نے بھی اس محاذ پر اپنا فرض ادا کیا اور کئی ترانے تحریر کئے جن میں وطن کے لئے ان کی محبت کی عکاسی ہوتی ہے ان دنوں وہ ریڈیو پاکستان لاہور میں سٹاف آرٹسٹ تھے اور یوں ترانے لکھنا ان کے فرائض میں بھی شامل تھا' لیکن غور کریں تو اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ ناصر کو پاکستان سے حد درجہ محبت ہے وہ کسی فطری جذبے سے مغلوب ہو کر لکھ رہا ہے۔ وہ محسوس کر رہا ہے کہ وطن کے سپاہیوں کو حوصلہ مند رکھنے کے لئے اسے کچھ کرنا ہے، جو اس دارالامان کی حفاظت کا فرض ادا کرتے ہیں۔

"پاکستان میں آکر میں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک دارالامان مجھے مل گیا ہے۔" (6)

اور پھر یہی جذبہ اسے اس امر پر اکساتا ہے کہ اس کی روح خود بول اٹھتی ہے۔

اے ارضِ پاک تو ہے دارالاماں ہمارا
دائم ہے تیرے دم سے نام و نشاں ہمارا
دشمن نہ چھو سکیں گے اب تیری سرحدوں کو
بیدار ہو چکا ہے اب کارواں ہمارا

(دارالاماں ہمارا)

ملک و ملت کی سلامتی ناصر کے لیے دل و جاں کا مسئلہ معلوم ہوتی ہے۔

اے مری خلدِ بریں تیری بہاروں کی خیر
اے مرے عزم و یقیں تیرے دیاروں کی خیر

تیرے ستاروں کی خیر

تیرے مکینوں کی خیر تیرے مکانوں کی خیر

میری جواں سر زمیں تیرے جوانوں کی خیر

زمزمہ خوانوں کی خیر
(تو ہے مری زندگی)

چوں کہ یہ ترانے عزم و ہمت سے بھرپور ہیں، اس لیے ان میں جوش، ولولہ اور تیز روی کا احساس ہوتا ہے۔ ٹھہرنے اور رکنے کی بجائے آگے ہی آگے بڑھنے کا انداز ہے۔ رواں دواں قافلوں کی داستان جن کے پاس عزم جواں کا زاد راہ ہے' ناصر نے ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ بیان کی ہے۔

پاک فوج کے جواں تو ہے عزم کا نشاں

تیرے عزم کے حضور سرنگوں ہے آسماں

تیرے دم سے جاوداں زندگی کی داستاں

شادماں رواں دواں

تیری ایک ضرب سے کوہسار کٹ گئے

دشمنوں کے مورچے ہٹ گئے، الٹ گئے

زلزلے پلٹ گئے

(پاک فوج کے جوان تو ہے عزم کا نشاں)

وطن عزیز سے محبت کا اظہار کبھی یوں بھی ہوا ہے۔

ہم کو ناز ہے اس گلشن پر

ہم نے کتنی جانیں دے کر!

اس کا رنگ ابھارا

گلشن پاک ہمارا

(گلشن پاک ہمارا)

"صدائے کشمیر" میں ناصر ایک خوشگوار امید لئے کہتا ہے۔

صدائے کشمیر آ رہی ہے، ہماری منزل قریب تر ہے
یہ عدل و انصاف کی گھڑی ہے، ستم کی معیاد مختصر ہے
لہو شہیدوں کا رنگ لایا
نئی سحر کی امنگ لایا
غرور کا ابر چھٹ رہا ہے
رخِ حوادث پلٹ رہا ہے

میجر عزیز بھٹی شہید کے بارے میں یہ معروف ترانہ بھی ناصر کاظمی کا ہے۔

تو ہے عزیزِ ملت، تو ہے نشانِ حیدر
احساں ہے تیرا ہم پر اے قوم کے دلاور
(تو ہے عزیزِ ملت)

اس جنگ میں سرگودھا اور سیالکوٹ کے کردار بڑے نمایاں رہے ہیں۔ سرگودھا اسی حوالے سے "شاہینوں کا شہر" کہلایا اور سیالکوٹ کے قریب چونڈہ میں ٹینکوں کی ایک بڑی جنگ لڑی گئی۔ ناصر نے ان دونوں شہروں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زندہ دلوں کا گہوارہ ہے سرگودھا میرا شہر
سب کی آنکھوں کا تارا ہے، سرگودھا میرا شہر
(سرگودھا میرا شہر)

اور......

زندہ رہے گا زندہ رہے گا، سیالکوٹ تو زندہ رہے گا
زندہ قوموں کی تاریخ میں نام ترا زندہ رہے گا
(سیالکوٹ تو زندہ رہے گا)

اس ترانے میں تغزل کا انداز جھلکتا ہے۔

تیرگی ختم ہوئی ، صبح کے آثار ہوئے
شہر کے لوگ نئے عزم سے بیدار ہوئے
شب کی تاریکی میں جو آئے تھے رہزن بن کر
صبح ہوتے ہی وہ رسوا سرِ بازار ہوئے
جگمگانے لگیں پھر میرے وطن کی گلیاں!
ظلم کے ہاتھ سمٹ کر پسِ دیوار ہوئے
شاخ در شاخ چمکنے لگے خوشبو کے چراغ
عالمِ خاک سے پیدا نئے گلزار ہوئے

دسمبر 1971ء کی جنگ جس کے نتیجے میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہوا، ایک محب وطن پاکستانی کی طرح ناصر کے قلب و جاں پر بھی وارد ہوئی۔ 1965ء کی جنگ کی طرح ناصر کاظمی نے اس جنگ میں بھی ترانے لکھے۔

چھائے ہیں فضاؤں پہ ہوا باز ہمارے
یہ قوم کے شاہین ہیں جرأت کے ستارے

(ہوا باز ہمارے)

"ہر محاذِ جنگ پر" ایک طویل نظم ہے جس میں ناصر کی حب الوطنی بول بول کر اس حقیقت کی گواہی بن رہی ہے کہ اسے اس وطن سے حد درجہ محبت ہے۔ اس کا محاذ اس کا قلم ہے اور وہ اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا ہے۔

اے مرے کریم رب تو نے اپنے بندوں کو ہزار ہا ہنر دیئے
اور مجھے قلم دیا

اے علیم تیرے علم کے حضور
میرے علم اور ہنر کی کیا بساط
آج مجھ کو اتنی مہلت اور دے کہ لکھ سکوں وہ داستاں
جو اپنے خوں سے لکھ رہے ہیں سرحدوں کے پاسباں
یہ صف شکن دلیر ہیں مرے قلم کی آبرو
انہی کے دم سے آج پھر مرا قلم ہے سرخرو
اب اپنے کاغذوں پہ چشمِ خوں فشاں کا نم نہیں
اب اپنے کاغذوں پہ جاتے موسموں کا غم نہیں
یہ کاغذ اپنے ہاتھ میں وہ کارگاہِ رزم ہے
جہاں پہ فتح قوم کا نشان میری نظم ہے
یہ کاغذ اپنے ہاتھ میں وہ بحرِ بے کنار ہے
جہاں ہر ایک موج فتح مند ذوالفقار ہے
یہ کاغذ اپنے ہاتھ میں ہے وہ فضائے بیکراں
جہاں ہوا کے پاسباں ہیں ہر طرف شرر فشاں

"ماہی گیروں کی جنت" (مرحوم مشرقی پاکستان) ناصر کاظمی کو حد درجہ عزیز تھی۔ یہ جنگ زیادہ تر اسی جنت میں لڑی گئی۔ ناصر نے اس جنت کی ٹھنڈی راتوں کے گیت بھی لکھے۔

تو جنت ہے میرے خوابوں کی
تری مٹی کے ہر ذرے میں
خوشبو ہے نئے گلابوں کی

تو دولت میری نسلوں کی
ترے دامن میں پوشیدہ ہے
تقدیر سنہری فصلوں کی

اور......

تو جنت ماہی گیروں کی
تو سندر بن مرے گیتوں کا
تو ٹھنڈی رات جزیروں کی

(اے ارضِ وطن)

اور پھر جب "ماہی گیروں کی یہ جنت" ہر پاکستانی کی طرح ناصر سے بھی چھن گئی تو وہ خون کے آنسو رویا۔ جس جنت کے لئے اس نے گیت لکھے وہ کھو گئی تو ناصر نے ساحلوں پہ گیت گانے والوں اور کشتیاں چلانے والوں کو بے طرح یاد کیا۔

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

......(دیوان)

اور یہی آواز ناصر کی آخری آواز ثابت ہوئی۔

"نشاطِ خواب" کی ان نظموں اور ترانوں کے علاوہ ناصر کاظمی نے کچھ انگریزی نظموں کے تراجم بھی کئے ہیں۔ مثلاً مغربی امریکہ کے گوالوں کے گیت جو ذیل کے عنوانات سے ملتے ہیں۔

1- سام ساس 2- خدا حافظ، بوڑھے پینٹ

3- ہوپی ٹی ہی یو، آگے بڑھو، میرے بچھڑو،

4- پرانے "چس ہوم" کا سفر

5- خون آلودہ زمین (امریکن سوسائٹی) ترجمہ ناصر کاظمی

......اردو مرکز' لاہور

"پرانے "چس ہوم کا سفر" نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو......

میں اپنے مالک کے پاس معاوضہ لینے کے لئے گیا

اس نے پہلے ہی حساب لگا رکھا تھا کہ میرے نو ڈالر بنتے ہیں

اب میں جلد سے جلد اپنا ساز و سامان بیچ دوں گا

اب میں کسی کم بخت کے لئے مویشیوں کا ریوڑ نہیں ہانکوں گا

اب میں اپنے گھوڑے کی زین پر مزے سے بیٹھ جاؤں گا اور آزادی کا سانس لوں گا

آئندہ میں گایوں کے ریوڑ کبھی نہیں لے جاؤں گا

اے میرے ریوڑ کے مالک خدا حافظ' میں تمہیں کوئی بد دعا نہیں دیتا

اس کام کو خیر باد کہہ کر اب میں کھیتی باڑی شروع کروں گا

ان نظموں کے علاوہ 61 صفحوں پر پھیلی ہوئی ایک نظم "سر کی چھلیا" (7) بھی ہے جس کو ناصر نے منظوم ڈرامے کے انداز میں لکھا ہے۔ مختلف کرداروں کے حوالے سے ناصر نے مختلف لہجوں کے ملاپ سے ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

"احمد۔ کچھ مہینے ہوئے میں نے بستی سے

دو میل پر پانچ ایکڑ لئے تھے' وہ عبدل......

وہی کنج گھر پھر چلایا ہے ہم نے'

وہی شیشہ گر مل گیا ہے۔

بس اب کام چلنے لگا ہے۔

فیاض ...... اچھا اچھا اب میں سمجھا۔

آپ اکبر کے حصہ دار ہیں۔

بڑا ہی نیک انسان ہے اکبر

احمد ...... تو کیا آپ اکبر سے واقف ہیں؟

وہ میرا ساتھی ہے"

"سر کی چھایا" ایک سفر کی روداد ہے جس میں مختلف زبانوں اور لہجوں کے لوگ سفر کرتے ہیں اور راستے میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔

یوں ناصر کاظمی کی نظموں پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناصر نظم گوئی پر قادر تھا البتہ وہ اس میں اپنی غزل گوئی کی سی انفرادی شان پیدا نہیں کر سکا۔ دراصل وہ تھا ہی بنیادی طور پر غزل گو...... اس لئے اس کا اصل مقام اس کی غزل کے حوالے سے ہی متعین ہوتا ہے۔ نظم اور نثر اس تعین میں معاون ضرور ہیں مگر غزل کے مقابلے میں انکی اہمیت ثانوی ہے۔ ناصر کی نظمیں اردو نظم کے ارتقائی سفر میں کسی روشن سنگ میل کی حیثیت سے تو نہیں، ناصر کے فن میں ایک حوالے کے طور پر زندہ رہیں گی۔

نثر

غالب نے آدمی کو محشرِ خیال کہا تو یہ بے جا نہ تھا، اور پھر ناصر جس صورتِ حال میں جی رہا تھا اور وہ جس تہذیبی ماحول سے بچھڑ کر آیا تھا...... وہاں اس "محشرِ خیال" کی معنویت دوچند ہو جاتی ہے۔ یادیں تعاقب میں ہوں اور حال کے ساتھ مطابقت کا

مسئلہ درپیش ہو تو اس موڑ پر انسان کے ذہن کی کیفیت کیا ہو گی؟ اور ناصر کے ہاں تو ہر قدم اور ہر راستے پر یہ موڑ آجاتا تھا کہ اسے حال کو اعتبار دینے کے لئے ماضی کی جانب دیکھنا پڑتا تھا...... یوں یہ منطقی سی بات نظر آتی ہے کہ "محشر خیالی" کے اظہار کیلئے بھی تنوع اور ورائٹی چاہیے۔ ناصر نے غزلیں کہیں تو شاید اس کا اظہار مکمل نہ ہو سکا اور نظمیں کہیں تو شاید کچھ کہانیاں ان کہی رہ گئیں۔ اس لئے تو اس نے نثر بھی لکھی کہ شاید اظہار کی داستان پوری ہو جائے...... یہ داستان ادھوری رہی یا شرمندۂ تکمیل ہو گئی...... سرِدست اس نکتے پر بحث کرنا مقصود نہیں، ہمیں تو اس کی اس نثر کا جائزہ لینا ہے جو مضامین، شذرات، دیباچوں اور گفتگوؤں اور مذاکروں کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔

ناصر کوئی بڑا نقاد نہیں تھا کہ وہ بعض بھاری بھر کم تنقیدی اصطلاحات کا اسیر ہو کر سنجیدہ، خشک اور ٹھوس قسم کے مضامین رقم کر دیتا......وہ تو ایک شگفتہ نگار ہے۔اور ہمیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ "برگ نے" اور "دیوان" کا اداس اور دکھی شاعر گاہے گاہے ہنس بھی لیتا ہے) وہ سنجیدہ موضوعات پر بات کرتے ہوئے بھی اپنے لہجے کی تازگی کو گم نہیں ہونے دیتا اور اس کی تخلیقی حس برابر اس کے ساتھ رہتی ہے۔ ناصر کے ایک دوست مظفر علی سیدّ نے لکھا ہے۔

> "کیا یہ ایک تہذیبی حادثہ نہیں ہے کہ ناصر جیسا شاعر نثر لکھنے بیٹھے تو ایک بہت بڑے موضوع کی ایک نہایت ہی جزوی تفصیل کے بارے میں محض لچھے دار گفتگو کر کے رہ جائے۔"(8)

اس میں شک نہیں کہ ناصر کے ہاں کہیں کہیں اس کے بعض کمزور اشعار کی طرح نثر بھی کمزور ملتی ہے اور وہاں لچھے داری بھی نہیں ہے کہ یہ بھی ایک فن ہے لیکن

ناصر کی نثر کے مجموعی تاثر کی روشنی میں یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ (اس کی نثر میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو اسے زندہ رکھ سکتی ہیں بلکہ میرے خیال میں اگر کسی فنی اور معنوی ترتیب کے نقطہ نظر سے ناصر کی غزل، نظم اور نثر کو پرکھا جائے تو اس کی خوبصورت غزل گوئی' کے بعد نظموں کی بجائے نثر آئے گی۔ اس کی نظمیں بھی اس کا فطری اظہار بلاشبہ ہوں گی لیکن مجھے ذاتی طور پر ناصر کی نثر اس کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت اور با معنی لگتی ہے کیونکہ اس کی نثر کا لہجہ بھی اس کی غزل کے لہجے کی طرح گفتگو کا لہجہ ہے۔ محفل میں موجود ہونے کے احساس کا لہجہ ہے) جب کہ ناصر کی نظمیں گفتگو کے لہجے سے خالی ہیں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ گفتگو کے لہجے کے علاوہ باقی سب لہجے مردود اور گردن زدنی ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ناصر کے لئے گفتگو کا لہجہ سب سے موزوں محسوس ہوتا ہے اور اس کی آواز پہ جچتا ہی یہی لہجہ ہے۔ اس میں ایک خاص طرح کی تہذیب اور متانت جھلکتی ہے۔

> "ناصر کی گفتگو اتنی اوریجنل اور تخلیقی تھی...... کہ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا ہے، بلند آواز میں شعر سوچ رہا ہے اور اس کی گفتگو ہمیشہ شعر و ادب کے بارے میں ہوتی تھی اور اشعار کے حقیقی مفہوم کو اجاگر کرنے کیلئے وہ زبان و بیان اور جذبہ و خیال کے بے شمار نکات کھولتا چلا جاتا تھا۔" (9)

بلند آواز میں شعر سوچنے کی سی کیفیت ہی دراصل اس کی نثر کو ایک منفرد اسلوب عطا کرتی ہے۔ اس کی نثر خود بول اٹھتی ہے کہ اس کا خالق ایک تخلیقی انسان ہے

جو نثر میں بھی شعر تخلیق کر رہا ہے۔ اس کے موضوعات اور اسلوب ایسا ہے کہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کی سوچ شاعرانہ اور اظہار بھی شاعرانہ ہے۔ اس کی نثر میں سے اگر محض تجربے کے طور پر شاعری کے ذائقے کو غائب کر دیا جائے تو اس کے اسلوب کا تمام تر ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ اس کی نثر میں، شاعری اور نثر باہم گھل مل گئی ہیں۔

اس حوالے سے اے حمید لکھتے ہیں:

(۱) "وہ نثر میں شاعری کرتا ہے، میں خود نثر نگار ہوں، مجھے حسرت ہی رہی کہ میں بھی ناصر کاظمی ایسی نثر لکھ سکتا۔"(10)

ناصر کی نثر میں کسی مربوط فکر یا فلسفے کو تلاش نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ وہ تحریریں ایک ایسے انسان کی ہیں جو شاعر ہے اور وہ بھی غزل کا...... اور غزل جس ریزہ خیالی سے مرتب ہوتی ہے اس کا اظہار ناصر کے ہاں غیر شعوری طور پر نثر میں بھی ہوا ہے۔ تاہم ناصر کی نثر الجھی ہوئی نہیں۔ الفاظ کے پس وپیش اور بے جا مینا کاری سے اس نے موضوع کو مبہم نہیں بنایا بلکہ اس نے توبات کو کھول کر بیان کر دیا ہے البتہ اس کا انداز تخلیقی ہے۔

ناصر کی نثر کا ایک پہلو جا جا سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ وہ موضوع کی وضاحت کے لئے سامنے کی اشیاء کے حوالے دیتا ہے' وہ چیزیں ہماری عام زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کے حوالے سے موضوع کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ناصر کی نثری تحریروں میں جیسا کہ پہلے کہا گیا تبصرے، دیباچے، گفتگوئیں، مذاکرے، مکالمے' ریڈیو فیچرز اور مضامین شامل ہیں۔ ان تحریروں میں تنقیدی اشارے بھی ہیں اور تجزیاتی لوازمات بھی، اور کہیں کہیں محض بات کر دینے کا انداز ہے۔ ناصر کی

بہت سی نثری تحریریں "خشک چشمے کے کنارے" کے عنوان سے چھپ چلی ہیں۔ اس کے ریڈیو فیچرز کا تجزیہ ڈاکٹر حسن رضوی نے اپنی کتاب "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر" میں پیش کیا ہے ان فیچرز تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔ یہاں ناصر کی نثری تحریروں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے اس جائزے میں چند ایسی نثری تحریریں بھی شامل ہیں جو "خشک چشمے کے کنارے"، ڈاکٹر حسن رضوی کی کتاب اور ناہید قاسمی کی کتاب "ناصر کاظمی شخصیت اور فن" میں شامل نہیں ہیں۔ تاہم اس جائزے میں ناصر کی چند ایسی تحریروں کا ذکر شامل نہیں ہے جو "خشک چشمے کے کنارے" میں موجود ہیں اور وہ عمومی نوعیت کی ہیں۔ اس مختصر سی بحث کے ذریعے اس امر کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مختلف موضوعات کے بارے میں ناصر کی سوچ اور خیالات سامنے آ جائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ غمِ عشق اور غمِ ہجرت کے شاعر کی نثر کس معیار اور درجے کی ہے۔

"ادب" اور "فن" کے بارے میں ناصر نے اپنی تحریروں اور گفتگوؤں میں بڑی معنی خیز باتیں کی ہیں۔

> "بڑا شاعر ایک بھرپور انسان بھی ہوتا ہے اور اس کی شخصیت کی بہت سی تہیں ہوتی ہیں مگر چوں کہ اس کا ذریعہ اظہار زبان ہے، اس لئے وہ اپنے تخلیقی سفر میں بھی تنہا نہیں ہوتا۔ وہ بے شمار تجربوں کے جہنم سے گزر کر اپنی جنت تخلیق کرتا ہے۔ لہٰذا پڑھنے والوں کو بھی اس کے فن کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لئے اس جہنم سے گزرنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ بڑے شاعر کا پڑھنا ایک سخت امتحان ہے، وہ ہر لمحہ آپ کو زندگی کے لئے

مے گوشے اور نئے تجربے سے روشناس کر کے چیلنج کرتا ہے۔
وہ کسی قدر بے درد اور پھکڑ بھی ہوتا ہے۔ بڑا شاعر کسی
ایک زمانے یا کسی ایک طبقے کے لئے نہیں لکھتا، اس لئے
اس کی شاعری ہر زمانے سے بار بار ایک نیا تقاضا کرتی
ہے۔" (11)

"میں نے لفظوں اور حرفوں کی قوسوں میں جان بھی
محسوس کی ہے اور ان کے پیچ و خم کی فریاد بھی سنی ہے." (12)

"لفظوں کا روایتی استعمال تو ہر شخص کرتا ہے لیکن ان میں
نئے معنوں کی روح پھونکنا فن کار ہی کا کام ہے۔ یہ
لفظوں کا قبیلہ بھی بڑا خودسر واقع ہوا ہے، جب بھی کسی
نئے لفظ کی ضرورت محسوس ہوئی تو زبان کے خیمے کے
باہر للکارنا پڑا کہ اس لفظ کی روح تو ہمارے خیالوں میں
ہے، اسے حاضرِ بزم کرو، شاعر تو لفظوں کو اس طرح
گرفتار کر لیتا ہے جیسے شیر ہرن کو اپنے پنجے میں دبوچ
لے۔" (13)

"اب کوئی یہ کہے کہ دنیا کے کام چھوڑ کر ادب ہی کیوں
تخلیق کیا جائے تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اس
(شاعر اور ادیب) کے پاس ذہن ہے، تصور ہے، یادوں کا
خزانہ ہے اور نا آفریدہ مستقبل کے خواب...... وہ ان

ہیولوں کو جسم دینا چاہتا ہے، جب تک انسان میں یہ
صلاحیتیں ہیں، تخلیق کا سرچشمہ رک نہیں سکتا۔" (14)

"سورداس نے کہا تھا۔

سب ندیاں جل بھر بھر رہیاں ساگر کس بدھ کھاری۔ یہ
"ندیاں" سورداس ہی کے ہم عصر فن کار ہیں۔ کسی بھی
زمانے میں کسی بھی فن کار کے ہم عصر ہو سکتے ہیں، ادب
کے ساگر میں تو کھاری پانی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ کھاری پن
کا اضافہ آخر کس کام کا' بے شک وہ چوڑے پاٹ کی ندیوں
کے ہی راستے سے ہو۔ نہر پتلی ہی سہی ، مگر پانی
خوش رنگ ہونا چاہئے اور میٹھا۔" (15)

"احساس کے بغیر شاعری ممکن ہی نہیں اور شاعر لازمی
طور پر کسی نہ کسی طرح حساس بھی ہوتا ہے۔ بلکہ تم نے
جو یہ فکر اور احساس کی تقسیم کی ہے، خاصی بے معنی ہے۔
فکر احساس کے بغیر ممکن ہی نہیں، احساس فکر کی پہلی
منزل ہے۔ اس سے زیادہ میں کیا کہوں؟" (16)

"کسی بھی زمانے میں سچی اور زندہ شاعری تازہ افکار، نت
نئے تجربات اور مشاہدات کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی
مگر نئی تہذیب کے کھوٹ نے تازہ افکار اور نئی واردات
کے کندن کو اس طرح ماند کر دیا ہے کہ آج کے بیشتر
شاعر، اوّل تو زندگی سے براہ راست فیضان حاصل کرنے

کے اہل ہی نہیں رہے اور اگر ہیں تو انہیں نقلی شاعری کی
بہتات نے آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔" (17)

" شاعر کبھی تجربے سے نہیں ڈرتا، بلکہ وہ تو نسلوں کے
تجربے اور مشاہدے کو سامنے رکھ کر مستقبل کے لئے
جیتے جاگتے پیکر تراشتا ہے۔ ان جانی حقیقتوں کا انکشاف
کرتا ہے' اور ان کارشتہ جانی پہچانی چیزوں سے اس طرح
ملاتا ہے کہ اس کے فن میں ماضی کی بھولی ہوئی تصویر بھی
ہوتی ہے۔ اور آنے والے واقعات کا پرتو بھی۔" (18)

" مجھے تو ہر ایسے شخص کی دوستی پر شبہ ہونے لگتا ہے جو ہر
بات کے حق میں ہو...... جو ادیب کسی بات کا مخالف
نہیں میں اسے سرے سے ادیب ہی تسلیم نہیں کرتا......
آج تک دنیا میں جو شخص بھی حق بات لے کر اٹھتا ہے تو
شروع شروع میں زیادہ تر لوگوں نے اسکی مخالفت کی ہے
بلکہ مخالفین ہی نے اسکی بات کو دوسروں تک پہچانے میں
سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔" (19)

" ادیب کے پاس وسائل نہ سہی مگر ایک وسیلہ تو ہے، یہ
وسیلہ لفظ ہے، یہ ایک سو ایک واں داؤں ہے، سو داؤں
اہل وسائل کے پاس ہیں، ایک سو ایک واں داؤں ادیب
کے پاس ہے اور یہ وہ داؤں ہے جس نے فرشتوں کو سجدہ

کرادیا تھا۔"(20)

"جس نے لفظ ایجاد کیا وہ پہلا شاعر تھا اور افسانہ نگار بھی۔
شروع میں سب لفظ شعر اور افسانہ تھے۔ بنیوں نے شاعروں
اور افسانہ نگاروں پر خار کھایا اور ان شعروں اور افسانوں
سے کاروباری کام شروع کر دیئے۔ اب زبان ایک سماجی
ضرورت کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری
اب یہ ٹھہری کہ ان لفظوں کے نیچے دبے ہوئے افسانوں
اور شعروں کو باہر لایا جائے۔"(21)

فن اور ادب و شعر کے بارے میں ناصر کاظمی کے یہ الفاظ کسی بڑے نقاد کے نہ سہی، ایک باہوش شاعر کے ضرور ہیں جو چیزوں کے بارے میں ایک واضح رائے رکھتا ہے۔ اس کی ایک سوچ ہے اور ایک نقطۂ نظر ہے جس کا وہ بے دھڑک اظہار کرتا ہے۔ یہ سوچ اور یہ نقطۂ نظر اس نے تجربے اور مشاہدے کے رنگ رنگ منطقوں سے گزر کر حاصل کیا ہے۔ اور اس کے ہاں اس سوچ اور نقطۂ نظر کا عملی اطلاق بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس نے جب یہ کہا کہ "صنف کو محض صنف ہی نہیں، بلکہ ادب بھی ہونا چاہیئے۔" تو اپنی شاعری میں اس قول کی صداقت کو ثابت بھی کیا ہے۔ اس کی غزل اگر محض ہیئت کے ترازو میں پوری اترتی تو اعلیٰ غزل ہر گز نہ بنتی۔ وہ ہیئت بھی ہے اور ادب بھی، اس میں زندگی اور تڑپ ہے...... اسی طرح اس کے دیگر خیالات محض خیالات نہیں ہیں بلکہ ان کی پشت پر ناصر کی سوچ، تجربے اور مشاہدے کی کار فرمائی ہے۔

"روایت" اور "انفرادیت" ادب کے معروف مسائل میں سے ہے۔ ادب

میں روایت کے پس منظر کے بغیر انفرادی صلاحیت اکثر خام رہتی ہے اور محض روایت کا قیدی ہو جانا بھی ادب کے لئے سود مند نہیں ہوتا، دونوں کی اپنی اپنی کچھ حدود ہیں۔ ناصر نے بھی مختلف موقعوں پر اس حوالے سے بعض مباحث اٹھائے ہیں۔

"روایت تو دراصل پورے اجتماع کے ماضی اور حال کے تجربات کی گونج ہے، خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں پھیلی ہوئی ہو۔ محض پرانے شاعروں کو پڑھ لینے سے تو سیدھی سادی غزل گوئی ہی نکل سکتی ہے۔"

"تیسرے درجے کا لکھنے والا محض روایت کا سہارا لے کر روایتی انداز میں روایتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور پرانے ماہرین کے فن کے بچے تلے مفروضوں کو بغیر ہضم کئے اگل دیتا ہے۔ تیسرے درجے کے لکھنے والے کے قاری بھی تیسرے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا روایت کو محض مؤرخوں کا زبدہ سمجھتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں اور عام انسان بھی اپنے جذبات کے ہجوم میں اپنے جذبات کی داد دیتا ہے۔ اسے شاعری یا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔"

"روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے۔ یعنی روایت وہ روح ہے جو کسی عصرِ رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس

کے لئے ایک پس منظر لازمی ہے۔"

"زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنا نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے ستارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔"

"حنیف! اگر تم کسی دن یہ اعلان کردو کہ مجھے تو سبز رنگ سرخ نظر آتا ہے تو مصوری کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ میرا مطلب ہے کہ میں اگر سبز گھاس کی جگہ سرخ گھاس لکھ دوں تو ہماری روایت کی پرانی حویلی میں ایک کہرام نہ مچے گا، کیوں کہ ان کے خیال میں گھاس سبز ہی ہوتی ہے۔ ویسے سرخ بھی ہوتی ہے۔"

"انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظر انداز کردے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی صلاحیت کے پنپنے کی گنجائش نہیں...... جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا۔"(22)

"روایت کی عبرت سرا میں رک جانا، زندگی کے لئے زہر قاتل ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے...... اب وقت ہے کہ ہم آسیب زدہ خوابوں سے نکل کر کھلے میدانوں میں اتر پڑیں، ہم نے تو دنیا کا

جغرافیہ بدل کر ایک نیا ملک بنایا ہے، کیا ہم اس کی نئی
تاریخ نہیں بنا سکتے، ہمیں تو روایت کا وہ حصہ لینا ہے جو
ہمارے خون کے ساتھ شامل ہو سکے۔ پرانی عمارتوں سے
نکل کر ذرا آگے بھی دیکھو۔"

"روایت کا مصرف یہی ہے کہ اس سے حرارت تو حاصل کی
جاسکتی ہے، اس کے سائے میں ڈیرے نہیں ڈالے جا سکتے
۔ جو کارواں کے اس الاؤ پر پڑا رہا اور اپنا الاؤ الگ نہ جلایا تو پھر
یہ الاؤ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ جب اپنے پاس آگ نہ ہو
، تو باہر کی آگ بھی حرارت نہیں پہنچاتی۔" (23)

روایت اور انفرادیت کے ان مباحث میں ناصر کاظمی نے ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ روایت سے روشنی اور بصیرت تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن مکمل طور پر اس پر انحصار کرنا نامناسب بھی ہے اور خطرناک بھی، اس لئے کہ اگر شعر و ادب محض روایت کی چھاپ بن کر رہ جائے تو اس میں انفرادیت کا رنگ پیدا کرنا ناممکن ہو گا۔ روایت کی اہمیت بہت زیادہ ہے تاہم کوئی شاعر یا ادیب اگر اپنا انفرادی تشخص چاہتا ہے تو اسے روایت کی اندھی تقلید سے آزاد ہونا ہو گا، تاہم روایت کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی نامناسب ہے۔

شعر و ادب میں ہم عصری کی بحث بھی بڑی اہم ہے اور عام طور پر ایک زمانے کے شعرا اور ادباء کو ہم عصر سمجھا جاتا ہے تاہم ناصر کاظمی کے خیال میں ہم عصری کا مفہوم درست نہیں۔ اس کے خیال میں ہم عصری ہم خیالی کو کہتے ہیں۔ اور ہم خیال لوگ دور ماضی میں بھی ہو سکتے ہیں اور مستقبل میں بھی، اس کے لئے ایک زمانے کا ہونا

ضروری نہیں۔

"دراصل تخلیق کرنیوالا شخص تنہا ہوتا ہے اور تنہائی اُسے
ماضی، حال اور مستقبل سے ملا دیتی ہے، میر تو خیر ہمارے
ماضی کا ورثہ ہیں میں تو اسلم انصاری کو بھی اپنا ہم عصر
سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے پندرہ سال بعد لکھنا شروع
کیا مگر وہ جب یہ کہتا ہے کہ

"اتنے سارے لوگ ہیں اور میں تنہا ہوں"

...... تو میری تنہائی جاگ اٹھتی ہے۔"

"اور جب میں کوئی غزل کہتا ہوں تو میر کو بھی سناتا ہوں
اور احمد مشتاق کو بھی" (24)

اردو غزل کی روایت میں میر، ناصر کاظمی کا پسندیدہ شاعر ہے اور جس طرح یادِ ماضی سے ناصر کو شعر کی تحریک ملتی ہے، اس طرح مطالعۂ میر سے اسے شعر گوئی کی ترغیب ملتی ہے۔ اس نے جہاں غزل میں میر کے اثرات قبول کئے وہاں جگہ جگہ اس کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"میر اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے زبان کو شاعری بنایا۔
دراصل وہ شاعری کے ساتھ ساتھ زبان ساز بھی تھا۔ اس
اعتبار سے اس کی اہمیت باقی رہے گی۔ میر نے اپنی زبان اور
اپنی زبان کے ادب کی تمام روایتوں کو نہ صرف تسلیم کیا
بلکہ ان سے ایک حد تک رشتہ بھی قائم رکھا۔" (25)

"میں نے اگر میر صاحب کو مانا ہے تو بڑے جھگڑے اور

فساد کے بعد...... میر اپنا جیون ساتھی ہے لیکن ایسا ساتھی

جس سے ہر قدم پر جھگڑا رہتا ہے۔ مدت سے ہم ایک

گھر میں رہتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں اور روٹھتے منتے رہتے

ہیں"۔(26)

"میر نے دلّی کے علاوہ دل میں بھی ایک دلّی بسائی ہوئی

تھی۔ وہ دل اور دلّی دونوں بستیوں سے الگ ایک نئی

بستی کی بات بھی کرتا تھا۔ اس کے نلئے دل اور دلّی

یعنی احساس کا منبع دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے، دل خرابہ جیسے دلّی شہر ہے

یوں تو جمنا کب سے بہہ رہی ہے لیکن یہ جمنا جب میر کی

آنکھوں سے ٹپکتی ہے تو محض جمنا نہیں رہتی اور میر کا

"دیدۂ گریاں" محض میر کا دیدۂ گریاں نہیں رہتا بلکہ اس

پورے دور کے زوال کی مجموعی کہانی بن جاتا ہے۔ یہاں

" نہر "symbol ہے۔ ایک پوری رواں دواں کیفیت

اور احساس کا......"

" میر کی کلیات کی مثال تو تاج محل کی سی ہے۔ آگرہ نے

تین شاہکار پیدا کئے' تاج محل، میر اور غالب"

"میر تو ایک بوڑھے برگد کے درخت کی طرح ہے جس

کی چھاؤں میں سفر کرنے والے شب بسری تو کر سکتے ہیں،
آگ جلا سکتے ہیں لیکن اگران میں جلدی ہی تازہ دمی نہ پیدا
ہو سکے تو برگد کی چھاؤں زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دے
گی۔ اس درخت کے نیچے جس نے منزل بنائی وہ نہ گھر
کا رہا نہ گھاٹ کا۔ کوئی تازہ سبزہ اور نئی پھلواری اس میں
پوری طرح پنپ نہیں سکتی...... اور اسکے نیچے بستی بھی
نہیں بسائی جا سکتی۔ البتہ ایک آواز اس کی شاخوں سے کبھی
کبھی سنائی دیتی ہے۔

اب جہاں آفتاب میں ہیں ہم
یاں کبھی سرو وگل کے سائے تھے

جو اس آواز کو سن لے تو درخت کی گھنی شاخوں سے ایک
روح اترتی ہے اور اسے اپنے اصلی ارم زار کی سیر کراتی
ہے۔"

"گلی، بستی، شہر، دریا، ملک، قصبہ اور نگر...... میر کے
یہاں یہ تصورو احساس کے حقیقی امیج ہیں جو واقعات،
اسباب اور تخیل کا مواد ہیں۔ میر ایک تخلیقی شخصیت
تھی۔ اس نے ایک پورے دور کو بنتے اور بگڑتے دیکھا۔ وہ
تقریباً ایک صدی تک زندہ رہا اور اس صدی میں اس نے
کتنے ہی نگر اجڑتے اور بستے دیکھے، یہ "گلی" بھی اس کے
ذہن کی ایک رہگزر ہے جو کبھی آباد تھی اور پھر اس کا یہ

حال ہوا کہ اس میں سے کوئی آرزو نہ گزرتی۔ یہ ویرانی اور
تنہائی اسے عمر بھر ستاتی رہی"۔ (27)

میر کے بارے میں ناصر کے ان خیالات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناصر کے خیال میں میر ایک بہت بڑا شاعر ہے جو بظاہر ایک انفرادی آواز رکھتا ہے مگر اس آواز میں ایک بڑی تہذیب اجتماعی طور پر بھی جلوہ گر ہے۔ میر کی غزل اپنے عہد کی بھرپور ترجمان ہے اور اس ترجمانی میں میر کی عظیم تخلیقی شخصیت جھلکتی ہے۔ میر نے اپنے تخلیقی تجربے اور اس کے تخلیقی اظہار سے تاریخ کو بھی زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

میر، خیال اور تجربے کے لحاظ سے ہی نہیں، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ایک روایت ساز اور رجحان ساز شاعر ہے اور وہ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس کی مثال برگد کے درخت کی طرح ہے، جس کے نیچے کسی اور پودے کی نشوونما ناممکن ہے۔ گویا اس کے سامنے ٹھہرنا آسان نہیں۔

ناصر نے یہاں اپنے اور میر کے ذہنی تعلق کی نشان دہی کی ہے کہ اُسے میر پسند ضرور ہے لیکن وہ اس کا اندھا مقلد نہیں۔ (جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے)

میر درد کی شاعری کو ناصر کاظمی "کھٹے آم" کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

"میر درد کے دیوان کو تصوف نامہ بھی سمجھ کر پڑھا جائے
تو جابجا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں دو
چیزوں کو پیوند لگایا ہے۔ مجاز اور حقیقت، زمینی حسن کی
تعریف سے مقصد خدا کی تعریف ہے تو اس میں

کیا مضائقہ ہے کیونکہ کائنات کی ہر چیز خدا کی عظمت اور برتری کا احساس دلاتی ہے مگر سیدھے سادے جسمانی عشق کو زبردستی عشقِ حقیقی سے تعبیر کرنا کس کتاب میں لکھا ہے۔ چوں کہ صوفی کائنات کو ایک واہمہ سمجھتا ہے اس لئے ایک صوفی شاعر کے کلام میں کائنات کے حسن اور اس میں رہنے بسنے والے انسانوں کے باہمی تعلق کی اہمیت کم ہو جاتی ہے"۔

"ان کی شاعری میں تصوف کی تمام منزلوں کے ساتھ ساتھ گوشت پوست کے عام محبوب کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام سطحی، غیر سطحی، اعلیٰ اور ارفع جذبات بھی ملیں گے جو ایک صحت مند زندہ انسان کی علامت ہیں، البتہ ان میں محبوب کا بوسہ لینے کی ہمت نہیں، بوسے کا تذکرہ ضرور موجود ہے۔ جس شخص میں بوسہ لینے کی ہمت نہ ہو وہ جسم کی گنگا میں کیوں کر اتر سکتا ہے اور جو شخص جسم کی گنگا میں اترنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا، وہ ہری کے درشن کیسے کر سکتا ہے، شاید اس لئے میر نے بقول آزاد، درد کو آدھا شاعر کہا ہے، مگر آدھا شاعر ہونا بھی کسے نصیب ہے"۔(1)

میر کا شیدا ناصر کاظمی غالب کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کرتا ہے۔

"غالب اور حکومت کی ٹکر محض سیاسی نہیں تھی۔ وہ

بادشاہ یا وزیر بھی نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ وہ تو بادشاہ کا رقیب

بننے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہاتھی کی سواری کو

اس کا بھی جی چاہتا تھا لیکن ماہرِ لسانیات کا الزام لینا اسے

ہرگز قبول نہ تھا۔ بادشاہ کو دراصل شاعری نہیں سیکھنی

تھی وہ تو زیادہ سے زیادہ لفظوں کی نوک پلک کے بارے

میں استفادہ چاہتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں کسی استاد کو بھی

بے استاد ہونا گوارا نہ تھا۔ پھر کیا ستم ہے کہ عجم کا ایک

سرورِ رواں بلی ماراں کے کوچے میں خاک پھانکتا پھرے اور

لال قلعہ میں زاغ وزغن کہرام مچائیں۔ ساری لڑائی یہی

تھی اور غالب کے رشک کا Thesis یہیں سے شروع

ہوتا ہے"۔(29)

"غالب کا دور وہ تھا جب ایک پوری تہذیب مٹ رہی

تھی۔ اس کے حصے میں بھی تلچھٹ آئی تھی لیکن اس نے

بڑے وقار سے ساقیٔ دوراں کی یہ پیشکش قبول کر

لی"۔(30)

"غالب کے Imagination اور اس کی شاعری سے تو

کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس کی شاعری میں ارضیت

کم نظر آتی ہے"۔(31)

میر اور غالب کی طرح اقبال کے بارے میں بھی ناصر کاظمی کے خیالات اس

کے منفرد انداز کی عکاسی کرتے ہیں۔

'میں نے شیخ عبدالقادر مرحوم سے اقبال کی خودی کے
ساتھ ساتھ اس کے کبوتروں کے شوق کی کہانیاں بھی
سنی ہیں اور وہ کہانیاں تو اس قدر ہیں کہ ان سے ایک پورا
مخزن مرتب کیا جا سکتا ہے...... اقبال کی شاعری میں کبوتر
نے بہت ساتھ دیا ہے۔ بلکہ شاہین کو بھی اپنی بلندیوں
سے زمین پر اتارا ہے۔ یہیں سے اقبال کی شاعری میں
ایک نیا فلسفہ جنم لیتا ہے"۔

"دراصل اقبال نے انسان سے رشتہ استوار کرنے کے
لئے تمام مخلوقات سے دوستی کی۔ جب اسے خیر البشرؐ نے
روشنی دکھائی تو وہ انسان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔
انسان کو اس نے کئی رویوں میں دیکھا اور اس نے اپنی
شاعری میں اسے جو اسماء عطا کئے ہیں وہ ایک پورا
فلسفہ حیات بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں"۔ (32)

غالب اور اقبال کے حوالے سے ناصر کاظمی کے خیالات سے ممکن ہے، کسی کو
اختلاف ہو لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ ناصر نے اپنا نقطۂ نظر کھل کر بیان کیا ہے۔
اس نے تو غالب، میر اور اقبال کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے بار بار اس پہلو کی نشاندہی کی ہے
کہ غالب اور اقبال کے فکر و اظہار پر میر کے اثرات ہیں (بہ حوالہ میر ہمارے عہد میں) یا
یہ کہ تینوں ایک مماثل نظامِ فکر کے تحت اظہار خیال کرتے ہیں۔ فرق یہ پیدا ہوا کہ
تینوں کو زمانے مختلف ملے۔ ان زمانوں کے تقاضے مختلف تھے۔ تینوں کے ذاتی حالات بھی
مختلف تھے۔ اس لئے تینوں الگ الگ شعری دھاروں کے طور پر نظر آتے ہیں۔

حفیظ ہوشیار پوری کی غزل کے بارے میں ناصر نے لکھا۔

> "حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے، لیکن اسکا قالب نیا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرنا چاہتا تھا............ جس زمانے میں حفیظ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کیلئے بہت بھاری زمانہ تھا، بیسیوں میں دوچار کا کہیں کچھ بناؤ تھا، لیکن حفیظ اپنی روش پر ڈٹا رہا"۔(33)

جن شعراء نے اردو نظم کو جدیدیت اور نئے پن سے آشنا کیا، ان میں میراجی کا نام حد درجہ نمایاں ہے اور اس کے باوجود کہ ناصر "نیا نظم گو" نہیں، اس نے میراجی کے بارے میں بڑی عمدہ باتیں کی ہیں۔ اور اس کی شاعری کے حوالے سے بامعنی تنقیدی اشارے کئے ہیں، اس نے بالخصوص اس پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ میراجی کی نظمیں اس کی اپنی دھرتی کی بوباس رکھتی ہیں۔

> "اختر شیرانی اور ان کے زیرِ اثر لکھنے والوں کی نظروں میں جب مناظرِ فطرت یا عورت کا تذکرہ آتا ہے تو زمین میں بس ایک رنگین سی دھند پھیل جاتی ہے لیکن میراجی مناظرِ فطرت ہوں یا عورت کا روپ ہو وہ انہیں زمینی استعاروں کے ذریعے پیش کرتا ہے اور اگر ان مراحل میں اس کی شخصیت کو پیش کرنا پڑ جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس لئے اس کی نظم پڑھتے ہوئے عورت کے روپ اور اس کی ساری لطافتوں اور کثافتوں کو

اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ چیزیں اور مناظر اس کے
یہاں زندہ اور ٹھوس ہوتے ہیں۔ رنگینی کا غلاف انہیں
دھندلاتا نہیں ہے"۔

"میراجی پر بہت سے ستم ہوئے ہیں۔ میراجی جب دیومالا
کا ذکر کرتا تھا تو اس کے پیش نظر پرانے ہندوستان کی
پوری دیومالا ہوتی تھی۔ یونانی دیومالا پر رابرٹ گریوز کی
کتاب پڑھ کر تو دیومالا کا عاشق نہیں ہوا تھا اور ایلیٹ کی
نظم ویسٹ لینڈ، اس نے بھی پڑھی تھی مگر اس کی جڑیں
اپنی زمین کی روایت میں تھیں، چینی شاعری سے آشنا تھے
مگر انہوں نے ادب کا محمد تغلق بننے کی کوشش نہیں کی۔
اصل میں میراجی نے انگریزی میں ایم اے نہیں کیا تھا
اس لئے اسے کبھی ادب کا دارالسلطنت بدلنے کا خیال ہی
نہیں آیا۔ یوں وہ پیرس اور ماسکو دونوں شہروں سے آشنا تھا
مگر خود پنجاب میں رہنا پسند کرتا تھا اور سچ پوچھو تو پنجاب
کی دھرتی میراجی کے گیتوں میں ہی نظر آتی ہے"۔(34)

ابن انشاء کی کتاب "چاند نگر" پر تبصرہ کرتے ہوئے ناصر کاظمی نے لکھا۔

"انشاء جی افتادِ طبع کے لحاظ سے بے شک رومانوی بلکہ
الف لیلوی مزاج کے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں محبت
کے سوا، نئے زمانے کے سیاسی اور نفسیاتی مسائل بھی ملتے
ہیں۔ وہ کافی حد تک ترقی پسندانہ موضوعات کو عزیز رکھتے

ہیں لیکن انہیں آنچل کا پرچم بنانے کا شوق نہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ ان کی نظموں میں نعرے بازی نہیں۔ بلکہ دھیمی
دھیمی دل کو چھو لینے والی کیفیات ہیں جو سچی شاعری کا
طرۂ امتیاز ہے"۔(35)

سجاد باقر رضوی کی غزل گوئی پر گفتگو کرتے ہوئے ناصر کاظمی نے کہا۔

باقر صاحب کے ذہن پر ہجر کی راتوں کے قرض کا احساس
شاید اس قدر شدید ہے کہ ان کی دنیا میں فطرت کے
خوبصورت فرشتے نہیں اترتے۔ رات، چاند، ستارے،
پرندے اور بدلتے موسموں کے رنگ ان کی غزل میں کہیں
نظر نہیں آتے، بس ایک اندھیری رات ہے یا مصروف دن
کے ہنگامے جس کے بیان کے لئے انہوں نے آواز، گونج،
سائے اور ہوا کے استعارے وضع کئے ہیں"۔

"جذبہ ان کے اشعار میں بالعموم عقل کا بھیس بدل کر
سامنے آتا ہے اور شاید اس لئے وہ میر کی بجائے غالب کو
اپنا رہبر بناتے ہیں کیونکہ غالب کا کلام ایک عقل مند باپ
کا سایہ ہے اور مصائب کی دھوپ میں باقر صاحب اس
سائے کی پناہ لیتے ہیں لیکن غالب کا سایہ ایک ایسے جن کا
سایہ ہے کہ اگر شاعر ذہین آدمی نہ ہو تو یہ اسے حواس
باختہ کر دیتا ہے"۔(36)

ان ادبی موضوعات کے علاوہ ناصر کاظمی نے ملے جلے بہت سے موضوعات

پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان موضوعات پر ایک نظر ڈالنے سے واضح طور پر اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اِس انتخاب میں ناصر کا ذوق جھلکتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ ناصر کے "نثری تنوع" کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً موسیقی سے ناصر کی رغبت اس کی شخصیت کا حصہ ہے۔ وہ موسیقی کے رموز سے آشنا تھا اور اس بارے میں اس نے جگہ جگہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی کوئی تنقیدی اہمیت نہ ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تحریریں ناصر کے مزاج کی تفہیم میں خاصی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

موسیقار بندو خان کی وفات پر ناصر کاظمی نے لکھا۔

"سارنگی کو سورنگی بنانے والا فنکار آج اس دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ تانت، لوہے اور تانبے کے تاروں سے جادو جگانے والی انگلیاں ساکت ہو چکی ہیں اور روح سارنگی سے رخصت ہو چکی ہے۔ اس سارنگی کا خالق اپنے خالق سے جا ملا ہے اور سر کی ندی سنگیت ساگر میں مل گئی ہے۔ اس ساگر میں جہاں سورنگ گھل مل کر ایک رنگ بنتے ہیں اور سارے سر مل کر ایک راگ کا روپ لیتے ہیں...... امر راگ، ابدی نغمہ استاد بندو خان کے اٹھ جانے سے پاکستان ایک بڑے فنکار سے محروم ہو گیا ہے اور پاک وہند برعظیم کے موسیقاروں کی انجمن میں ایک ایسی نشست خالی ہوئی ہے جو شاید اب پُر نہ ہو سکے"۔

"سارنگی ہندوستانی سازوں میں سب سے اہم اور مشکل ساز ہے۔ گلا بادشاہ ہے اور یہ وزیر بلکہ وزیراعظم...... گلے

کے ساتھ سارنگی کے سوا کوئی دوسرا ساز نہیں چل سکتا
اور اسے بجانا بہت ہی مشکل ہے"۔(37)

"کبوتر بازی" ناصر کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس بارے میں اس نے جا بجا بہت سی ایسی باتیں
کہی ہیں جس سے اس کی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"کبوتر خوبصورت اور معصوم پرندہ ہے اور دنیا کے ہر خطے
میں پایا جاتا ہے۔ اس کے پیروں کی "کن کن" اور اسکی
"غٹر غوں" کی جادو بھری آواز آسمان وزمین کی وسعتوں
میں آٹھوں پہر جھنجھناتی رہتی ہے۔ یہ موسیقار ہے، یہ
ننھا سا پنکھ پکھیرو شہروں اور بستیوں کی ایک معزز اور حسین
مخلوق ہے اور ہر خرابہ اس کے دم سے آباد ہے۔ ہر ملک
کے شوقین، زندہ دل اور آسودہ حال انسان اسے بڑے پیار
سے پالتے ہیں۔ بچے اسکی غڑغوں کی لوریاں سنتے ہیں،
بوڑھے اور بیمار اس کے پروں کی ہوا سے تازہ دم ہوتے
ہیں اور فنکار اس کی پرواز میں ڈوب کر زمین و آسمان کے
بے پایاں رشتوں کی کڑیاں ڈھونڈ لاتے ہیں"۔(38)

"کبوتر رزم وبزم میں ہمارا ساتھی اور ہمارا رفیق ہے۔
زندگی میں حسن، معصومیت اور خوشحالی کی علامت اور
حیاتِ دیگر میں ولایت، برگزیدگی اور عظمت کا نشان......
کبوتر ہواؤں، فضاؤں، بلندیوں اور وسعتوں کا پرندہ ہے۔
سو اس کے پر قینچ کرنا گناہِ عظیم سے کم نہیں۔ اردو غزل

کی تعریف کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ اردو غزل
پر قینچ کبوتر کی دکھ بھری فریاد ہے"۔(39)

سانپوں کے بارے میں ناصر کاظمی کی معلومات اور انداز نظر کچھ یوں ہے۔

"سانپ اور آدمی کا ازلی رشتہ ہے۔ سانپ آدمی کا ازلی
دشمن ہے۔ اس کے متعلق بے شمار قصے، کہانیاں اور معین
تاریخی واقعات کتابوں میں ملتے ہیں۔ ہندو دیو مالا میں
سانپ دیوتا ہے اس لئے ہندو سانپ کی پوجا کرتے ہیں اور
اسے دودھ پلاتے ہیں۔ ہند دیومالاؤں میں برہما جو تخلیق کا
دیوتا ہے' اس کی مورتی کے سر پر سانپ کے پھن کا سایہ
ہوتا ہے اور اس کے گلے میں سانپ کے موتی ہوتے
ہیں۔ کہتے ہیں کہ سانپ سو برس کے بعد جو بھی قالب
چاہے، اختیار کر سکتا ہے مگر وہ اپنا جون بدلنے کے بعد
آنکھیں نہیں جھپک سکتا، سانپ اپنا جون بدل لینے کے بعد
آدمی کے خیالات کو جان سکتا ہے اور جو خیال چاہے اس
کے دل میں ڈال سکتا ہے"۔(40)

ہرن کے بارے میں ناصر کاظمی نے لکھا ہے۔

"جانوروں کی دنیا میں یہ ایک نایاب مخلوق ہے۔
آہوئے تاتار یا آہوئے ختن اسی لئے مشہور ہے۔ کالا
ہرن اکثر اپنی ڈار سے الگ رہتا ہے اور اپنے مشک نافے کی
خوشبو میں مگن رہتا ہے اس کی خوشبو سے دور دور تک

جنگل مہک جاتے ہیں۔ فارسی شاعری میں ہرن حسن کا
اسم یا علامت ہے۔ وحشی غزال وغزال رمیدہ، آہوئے
رمیدہ، آوارہ غزال، غزالانِ ختن یہ سب حسن کے
استعارے ہیں جن سے فارسی غزل پٹی پڑی ہے"۔ (41)

ناصر کاظمی کی نثر کا ایک خوبصورت انداز یہ بھی ہے۔

"پچھلے دس سال میں پاکستان نیا پاکستان بن گیا ہے۔ دس
سال پہلے کی لڑکیاں خط لکھنا تو جانتی تھیں، انھوں نے وہ
رومانی افسانے بھی پڑھے تھے جن سے استفادہ کر کے
خطوں کو موثر اور دل گداز بنایا جا سکتا ہے۔ نئی لڑکی فلمی
رسالوں سے استفادہ کرتی ہے اور خط لکھ کر بالائی مزہ لیتی
ہے۔ نیلے گنبد کی سٹیشنری کی دکان پر جائیے تو خوبصورت
پیڈ نہیں ملتا۔ پتہ چلتا ہے کہ لڑکیاں لے گئیں، ان کی
خواب گاہ پر چھاپہ ماریئے تو کچھ کتابیں ملیں گی اور باقی
خطوط کا انبار جو پوسٹ نہ کئے جا سکے"۔ (42)

"ہمایوں" کے نائب مدیر کی حیثیت سے ناصر کاظمی نے لکھا۔

"انجمن ترقی، اردو (پاکستان) نے اپنی پچاسویں سالگرہ کے
موقع پر کراچی میں ایک عظیم الشان جشن منعقد کیا۔ گورنر
جنرل نے اس جلسے کا افتتاح کیا اور حکومت کی طرف سے
انجمن کو پچاس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ انھوں نے انجمن
کے کام کی تعریف کی اور کہا کہ قومی سیرت کا مناسب

اظہار اپنی ہی قومی زبان کے ذریعے ہو سکتا ہے"۔(43)

"عشق، ادب اور دیومالا" (44) کے عنوان سے ناصر کاظمی نے ایک مذاکرے میں بھی شرکت کی ہے۔ لیکن اس مذاکرے میں خلافِ معمول ناصر کم وبیش خاموش رہا اور صرف دو مقامات پر بات آگے بڑھانے کی غرض سے اس نے گنتی کے دو جملے کہے۔ جن کی کوئی اہمیت نہیں۔

ان نثری تحریروں کے علاوہ ناصر کا ریڈیو پروگرام "سفینۂ غزل" اس سلسلے میں بڑا اہم ہے۔ یہ پروگرام براہِ راست ناصر کے تنقیدی خیالات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اردو غزل کی پوری روایت کے نمایاں شعراء کے حوالے سے یہ فیچر ناصر نے خود لکھے اور خود اپنی آواز میں پیش کئے۔ ان کے صاحبزادے باصر سلطان کاظمی نے زبانی طور پر بتایا کہ اس پروگرام میں ولی، میر، سودا، غالب، آتش، ناسخ، امیر مینائی، اصغر، داغ، فانی، نظیر اکبر آبادی اور اقبال جیسے اہم شعراء شامل تھے۔ اس پروگرام میں پہلے نثری گفتگو ہوتی تھی اور پھر شاعر کی منتخب غزلیں مختلف گلوکاروں کی آواز میں پیش کی جاتی تھیں۔(45)

یوں ان نثری تحریروں کے مطالعے سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ "برگِ نے"، "دیوان" اور "پہلی بارش" کا خالق اچھی نثر بھی لکھ سکتا ہے۔ متنوع موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ناصر کا انداز اس کی شاعری کی طرح اداس کر دینے والا نہیں۔ سنجیدہ اور شگفتہ اسلوب کے ملاپ سے ناصر نے اپنی نثر کا ایک ایسا اسلوب وضع کیا ہے جو اس کا اپنا ہے...... ایک تخلیقی اسلوب...... چھوٹے چھوٹے جملے مگر تکمیل سے بھرپور۔ لفظوں کا کم سے کم استعمال...... مگر کامل ابلاغ...... یہ وہ بنیادی اشارے ہیں جن سے ناصر کی نثر کی ادبی قدر قیمت کا تعین ہو سکتا ہے اور اس بناء پر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اچھی غزل کہنے کے علاوہ ناصر نے اچھی نثر بھی لکھی، جس میں انفرادیت جھلکتی ہے۔

حوالہ جات

1- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" (مکالمہ) سویرا، شمارہ 17-18، ص 218

2- "نشاطِ خواب" ...... شائع کردہ مکتبۂ خیال، لاہور

3- انتظار حسین، "چار گھڑی یاروں کا میلہ" احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 34

4- ناہید قاسمی، ناصر کاظمی، شخصیت اور فن، ص 200

5- ناصر کاظمی، "آخری گفتگو" احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 194

6- ناصر کاظمی، "آخری گفتگو" احمد مشتاق، ہجر کی رات کا ستارا، ص 194

7- "سر کی چھایا" کتابی صورت میں بھی چھپ چکی ہے (1981ء)

8- مظفر علی سید "ناصر کاظمی، ایک گم گشتہ نوا" احمد مشتاق ہجر کی رات کا ستارا، ص 109

9- احمد ندیم قاسمی "ناصر کاظمی کی یاد میں" فنون، اپریل 1972ء، ص 28-29

10- اے حمید "یادوں کے گلاب" روزنامہ امروز، 19 مارچ 1972ء

11- ناصر کاظمی، "جان پہچان، بنائے تازہ" سویرا، شمارہ 19-20-21، ص 259-282

12- ناصر کاظمی، "رفتار کا بدن" (مکالمہ) سویرا، شمارہ 19-20-21، ص 494

13- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" (مکالمہ) سویرا، شمارہ 17-18، ص 220

14- ناصر کاظمی، "نیا اسم" (مکالمہ) نیا دور، شمارہ 7-8، ص 92-102

15- ناصر کاظمی، "افسانہ نگار کی تلاش" (چائے کی میز پر گفتگو) ماہ نو، مارچ 1955ء، ص 27

16- ناصر کاظمی، "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" (مذاکرہ) ماہ نو، ستمبر 1954ء، ص 21

17- ناصر کاظمی، "نئے سوالات، میرا مسئلہ کیا ہے" ادب لطیف، سالنامہ 1963ء، ص 89-90

18- ناصر کاظمی، "غالب اور ہم" (مذاکرہ) ماہِ نو، مئی 1954ء، ص 56

19- ناصر کاظمی، "غالب کے طرفدار نہیں" (مذاکرہ) ادبِ لطیف، اکتوبر 1962ء، ص 9

20- ناصر کاظمی، "خطبۂ صدارت" لفظ، 1972ء، ص 139

21- ناصر کاظمی، "نیا اسم" (مکالمہ) نیا دور، شمارہ 7-8، ص 100

22- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" (مکالمہ) سویرا، شمارہ 17-18، ص 199-220

23- ناصر کاظمی، "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" (مذاکرہ) ماہِ نو، ستمبر 1954ء، ص 24-26

24- ناصر کاظمی، "میرا ہم عصر" (مذاکرہ) ادبِ لطیف، نومبر 1962ء، ص 6-7

25- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" (مکالمہ) سویرا، شمارہ 17-18، ص 206

26- ناصر کاظمی، "جان پہچان، بنائے تازہ" سویرا، شمارہ 19-20-21، ص 261-262

27- ناصر کاظمی، "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" (مذاکرہ) ماہِ نو، ستمبر 1954ء، ص 21-27

28- ناصر کاظمی، "کھٹے آم کی تلاش" 1963ء کے بہترین مقالے، ص 70-72

29- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" (مکالمہ) سویرا، شمارہ 17-18، ص 211

30- ناصر کاظمی، "نیا اسم" (مکالمہ) نیا دور، شمارہ 7-8، ص 95-96

31- ناصر کاظمی، "غالب اور ہم" (مذاکرہ) ادبِ لطیف، مئی 1954ء

32- ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت" (مکالمہ) سویرا، شمارہ 17-18، ص 213-214

33- ناصر کاظمی، "حفیظ ہوشیار پوری" نقوش (شخصیات نمبر) ص 1109

34- ناصر کاظمی، "شخص اور عکس" ادبِ لطیف، فروری 1963ء، ص 9-10

35- ناصر کاظمی، "مطبوعات" ہمایوں، اکتوبر 1955ء، ص 283

36- ناصر کاظمی، "شہری فرہاد" (دیباچہ) تیشۂ لفظ، (سجاد باقر رضوی)

37- ناصر کاظمی، "سارنگی کو سور نگی بنانے والا فنکار" روزنامہ "آفاق" لاہور، 17 جنوری 1955ء

38- ناصر کاظمی، "کبوتروں کے بارے میں" روزنامہ "آفاق" لاہور، 7 فروری، 1955ء

39- ناصر کاظمی، بہ حوالہ "ناصر کاظمی کے کبوتر" (ارشاد صدیقی) ماہِ نو، جون 1977ء

40- ناصر کاظمی، "سانپ کے قصے" ادبِ لطیف، فروری 1965ء، ص 18

41- ناصر کاظمی، "آج غزال ایک رہبر بن کر" آفاق، لاہور، 3 جنوری 1955ء

(نوٹ: یہی مضمون "ہرن کے شکار" کے عنوان سے نومبر 1956ء میں "ہمایوں" میں شائع ہوا)

42- ناصر کاظمی، "پاکستان کی نئی عورت، میر کے زمانے کی عورت"

(مذاکرہ) ادبِ لطیف، جون 1964ء، ص 39

43- ناصر کاظمی، "شذرات" ہمایوں، نومبر 1953ء، ص 662

44- ادبِ لطیف، نومبر 1965ء

45- ناصر کے ریڈیو، ٹی وی پروگرام مختلف عنوانات سے ان کی کتاب "خشک چشمے کے کنارے" میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر حسن رضوی نے اپنی کتاب "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر" میں ان پروگراموں کی تفصیل بھی دی ہے۔

باب پنجم

سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسے گا

(جدید اُردو غزل میں ناصر کاظمی کا مقام)

ناصر کاظمی نے نظمیں بھی کہیں اور نثر بھی لکھی، لیکن جس حوالے سے اس کی شناخت ہوتی ہے وہ غزل کا حوالہ ہے۔ وہ شاعر تھا تو زندگی کی ہر ایک سطح پر اس کا رویہ شاعرانہ تھا۔ اس کی زندگی کے شب و روز بھی شاعرانہ تھے، اس کی گفتگو شاعرانہ اور پھر ذات کا ہر ایک اظہار شاعرانہ تھا، اس نے اظہار کے لئے غزل کا وسیلہ اختیار کیا جو اس کے مزاج سے میل کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس بھرپور انداز میں اس نے غزلیں کہیں، اس کی نظم اور نثر اس انداز سے محروم رہی، یوں شاعری میں اس کے مقام اور مرتبے کا تعین غزل ہی کے حوالے سے ہو سکتا ہے، غزل ہی اس کی ذات کا سچا اظہار ہے۔

ناصر نے جب یہ کہا کہ :

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن   کیسا سنسان سماں تھا پہلے
ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں   درد مجبورِ فغاں تھا پہلے!
ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق   شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے!
ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار   عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

ــــ تو ان دعووں کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔ اس اعتماد کا ایک پس منظر ہے، اور

یہی پس منظر ناصر کی غزل کو وہ پہلا بڑا اعزاز عطا کرتا ہے جس کے حوالے سے ناصر کی غزل ویرانوں میں بہار کی آہٹ بن کر وارد ہوتی ہے۔ یعنی وہی دور جب ہر سو نظم کے چرچے تھے اور غزل فرسودہ گوئی کی علامت بن کر رہ گئی تھی، ناصر نے اس فرسودگی میں تازگی پیدا کرنے کا حوصلہ کیا۔ حسرت، فراق اور جگر اس دور میں زندہ تھے اور غزل کہہ رہے تھے۔ مگر وہ شے جسے حرکت اور تازگی کہا جا سکتا ہے، غزل میں کم کم تھی، ناصر نے اول اول فراق کے اثرات قبول کیے، لیکن کسی لمحے اس حقیقت کو فراموش نہ کیا کہ اس کی حیثیت فراق سے الگ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی آواز فراق سے الگ شناخت کی جاتی ہے۔ اثرات کی بات چلے تو اردو غزل کے عظیم شاعر میر نے بھی ناصر کو حد درجہ متاثر کیا۔ جس کے تحت ناصر نے چھوٹی بحر کی غزلیں کہیں، دھیمے لہجے کو اپنا انداز گفتگو بنایا، کبھی لمبی بحروں کے ذریعے موسیقی پیدا کی، لیکن ناصر جانتا تھا کہ میر اور اس کے عہد کے بعض مشترک واقعات کے باوجود وہ میر سے مختلف ہے۔ ناصر کی طرح میر نے بھی ہجرت کی تھی، لیکن جس انداز میں ہجرت کا تجربہ ناصر پر وارد ہوا ہے' میر اس شدت سے محروم رہے ہیں۔ ہجرت ناصر کے لئے قلب و جاں کا معاملہ ہے، جس کو انتظار حسین کی رفاقتوں نے دو چند کر دیا، میر کو ایسی رفاقتیں نہ مل سکیں اور نہ تجربے کی وہ شدت مل سکی، جس کے زیر اثر ناصر کی غزل نے حقیقی نشوونما پائی، اس نے نظم کے شور میں غزل کی لَے بلند کی، یہ اس کی بہت بڑی انفرادیت تھی، میر اس کے لئے روایت کے سمندر کا ایک بڑا دھارا تھا۔ ناصر نے روایت کے اس دھارے کو جس میں میر کے علاوہ غالب اور اقبال بھی تھے، اپنے اس عہد کی بھی سچائی بنانا چاہا جس میں وہ جی رہا تھا۔ اس لئے تو اس نے کہا کہ:

"میں اپنی غزل میر کو بھی سناتا ہوں، اور احمد مشتاق کو

بھی۔" (1)

میر روایت کی علامت اور احمد مشتاق، ناصر کے عہد کا ایک شاعر ہے۔ یوں ناصر نے میر اور احمد مشتاق کے درمیانی فاصلے کو اردو غزل کی روایت کے حوالے سے دیکھا ہے، اور واضح طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ناصر روایت اور جدت و جدیدیت دونوں کا رمز شناس تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ میر کے ساتھ بھی زندہ ہے اور احمد مشتاق کے ساتھ بھی جی رہا ہے۔ اس کے سامنے روایت کی وہ ساری مسافتیں ہیں جن سے اردو غزل گزر کر آئی ہے، اور وہ اس عہد کی آواز بھی سن رہا ہے جس میں احمد مشتاق کچھ کہہ رہا ہے، میر اور احمد مشتاق کی آوازیں دو رجحانات کی عکاس ہیں اور ناصر نے انہی دو رجحانات سے اپنا لہجہ بنایا ہے۔ روایت کا احترام اور جدیدیت کا استقبال ناصر نے اسی حوالے سے کیا ہے۔ میر ماضی کی آواز ہے اور احمد مشتاق حال کی...... لیکن ناصر کی نظریں تو مستقبل کے افق پر بھی ہیں۔

"میر تو خیر ہمارے ماضی کا ورثہ ہیں، میں تو اسلم انصاری کو بھی اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے پندرہ سال بعد لکھنا شروع کیا، جب وہ یہ کہتا ہے کہ......" اتنے سارے لوگ ہیں اور میں تنہا ہوں" تو میری تنہائی جاگ اٹھتی ہے۔" (2)

یوں ناصر کاظمی ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں سے وہ ماضی کی آوازیں سنتا ہے، حال کے تقاضوں کا ادراک بھی کرتا ہے اور مستقبل کے اشارے بھی سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل تین جہتوں سے تشکیل پاتی نظر آتی ہے۔ اس میں روایت کا ایک ایسا شعور شامل ہے جس کے بغیر اچھی غزل کی تخلیق ناممکن تھی، لیکن اگر ناصر

محض روایت کے اس شعور کا اسیر رہتا تو اس کی اپنی آواز دب کر رہ جاتی، اس نے نئے تقاضوں کا احترام کرنا بھی سیکھا تھا، ہر آن تغیرات کی زد میں آتی ہوئی زندگی اس کے بھی پیشِ نظر تھی، اس لئے اس نے روایت کا دامن تھام کر اس انسان کی آواز پیدا کی جو روایت کے انسان سے بہر حال مختلف تھا۔

> "نئی نسل کا نوجوان جن حالات سے دوچار ہے، جن معاملات و مسائل کا اس کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں جو کچھ اس پر بیت رہی ہے۔۔ اس کا پر تو ناصر کاظمی کی غزل میں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں نئی زندگی کا احساس ہے، نئے حالات کا شعور ہے، نئے حقائق کا ادراک ہے اور ان سب کے مجموعی امتزاج نے ان کی غزل کو ایک نئی لے سے آشنا کیا ہے۔ ان پر غزل کی روایت کے اثرات ہیں لیکن انہوں نے روایتی انداز میں غزلیں نہیں کہی ہیں۔ ان کی غزلیں تو ان کے تجربات کی نشان دہی کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک نیا لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔" (3)

ناصر کی غزل کا بیشتر حصہ عشقیہ شاعری پر مبنی ہے۔ اردو غزل کی روایت ایک ایسے عشق کی تصویر پیش کرتی ہے، جو سراپا نیاز ہے۔ جو اظہار کی قدرت سے محروم اور پسپائی سے عبارت ہے، جو انفعالیت سے بھر پور اور قوت عمل سے خالی ہے۔ ناصر نے اس عشق کا احترام کیا تو یوں گویا ہوا۔

ترے ملنے کو بے کل ہو گئے ہیں   مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں
بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم   وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں
یہاں تک بڑھ گئے آلام ہستی   کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں

مٹی مٹی سی امیدیں، تھکے تھکے سے خیال
بجھے بجھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے
ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا
یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہلِ دنیا نے
کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست!
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے
امیدِ پرسشِ غم کس سے کیجئے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

لیکن کیا ذیل کے اشعار کی یہ آواز اس سے مختلف نہیں؟ یہ نئے انسان کی آواز ہے، جس میں گرفتہ دلی ہے۔ یہاں محبوب کے نام سے کبھی کبھی وحشت بھی ہوتی ہے، راحتوں میں بھی ناراحتی کا احساس رہتا ہے، قربتِ یار سے بھی بعض اوقات آسودگی نہیں ملتی، اور دل پرانے غموں، پرانے چہروں پرانی یادوں سے گھبرا بھی جاتا ہے، اداسی کچھ دیر کے لئے غائب ہو جائے تو آرزو کے مٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے، اور کبھی انتظار کی لذّت بھی لذّت نہیں رہتی۔

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی !
اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی !
تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا،
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

ترے جلو میں بھی دل کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں
کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے،
اب ان دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں
مجھے یہ ڈر ہے، تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

نصیبِ عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں
بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں
زمانہ پرسشِ غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ تیرا غم، غمِ لیل و نہار بھی تو نہیں
وفا نہیں، نہ سہی، رسم وراہ کیا کم ہے
تری نظر کا مگر اعتبار بھی تو نہیں

آرائشِ خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو
یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر — جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طلسم — اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

یہ باتیں اس نئے انسان کی ہیں جو ناصر کے عہد کا انسان ہے، اور آج کے اس عہد کا بھی، جو ناصر سے اگلی نسل کا عہد ہے۔ زندگی کی تہہ در تہہ پیچیدگیاں اور نوع بہ نوع مسائل اس قدر شدید ہیں کہ شوقِ معاملات بھی اس سے متاثر ہیں۔ جب پروین شاکر نے کہا کہ "وہ یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد" یا فیض نے کہا کہ کچھ عشق کیا کچھ کام کیا" تو اس پہلو کی معنویت واضح ہو جاتی ہے جو ناصر کے ہاں بھی موجود ہے۔ محبت جس کی تصویر، ناصر نے پیش کی ہے، زندگی سے الگ کوئی شے نہیں وہ موجود ہے مگر زندگی پیچیدگیوں اور الجھنوں میں گھری ہوئی ہے۔۔۔ الجھنوں اور مسائل سے آزاد زندگی کی خواہش غالب نے بھی کی تھی۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیئے ہوئے!

اور پھر ناصر کا عہد تو غالب کے عہد سے بہت آگے ہے۔ جب تصورِم جاناں کے لئے فرصت کے رات دن اور کم ہو گئے تھے گویا ناصر کی غزل میں ماضی، حال اور مستقبل، تینوں زمانوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ناصر کی غزل شوق سے سنی اور پڑھی جاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ناصر نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں

ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا!

ناصر کو ہر محفلِ سخن میں ڈھونڈا گیا یا نہیں، یہ ایک الگ معاملہ ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کی غزل میں عظیم شاعری کے نقوش نہ سہی، بڑی شاعری کے

عکس ضرور لرزتے ہیں، وہ بڑی شاعری جو اپنے اندر نہ صرف زندہ رہنے کی سکت رکھتی ہے بلکہ دوسروں کو بھی زندگی عطا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ناصر کی غزل پر بات کرتے اسے اس پہلو پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ ناصر کی غزل میں اسکی ذات بڑی شدت سے جھلکتی ہے کہ اس میں عمومیت کا شائبہ تک نہیں ملتا(4) اس رائے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، اس لئے کہ ناصر کی آواز تو بہت سے دلوں کی آواز بنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے خود کہا تھا۔

"دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بھی بن سکتی ہے
یا نہیں۔" (5)

ناصر کی آواز ہزاروں کی آواز بنتی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی داستان میں کتنے ہی دلوں کی دھڑکنیں ہوں گی۔ دکھ، اداس اور محرومی ناصر کی اپنی سہی، لیکن کیا خبر کہ اس اداسی اور محرومی کا تعلق ہمارے ساتھ بھی ہو اور اس آواز میں ہمیں اپنا ہی دکھ بولتا ہوا محسوس ہو۔ ناصر کے رت جگے اس کے اپنے سہی مگر ممکن ہے ان کے اندر دور کہیں ہماری بھی کوئی نیند شامل ہو جو کسی اداس رات کی نذر ہو گئی ہو، آج ہمیں اگر انسانوں سے بھری گلیاں اور بازار زندگی سے خالی محسوس ہوتے ہیں اور چلتے پھرتے انسانوں پر بے حسی کی وجہ سے پتھروں کا گمان گزرتا ہے تو ہمیں ناصر کی غزل میں اپنے ہی تجربے اور احساس کی بازگشت ضرور سنائی دے گی۔ ناصر کی غزل محرومی کا ایک طویل استعارہ ہے اور کیا آج کے نوجوان کی زندگی رنگ رنگ محرومیوں سے عبارت نہیں، ان محرومیوں کو ناصر نے زبان عطا کر دی تو اس نے کتنے ہی لوگوں کے جذبات کو اظہار کا لباس دیا...... رہا اس کے شعری اثرات کا معاملہ...... تو اس حوالے سے بھی اسے بہت سے قدر داں ملے ہیں۔ اس کی غزل میں ایسے شعری تجربوں کی توانائی ہے جس کو اس سے جونئیر شعرا نے بڑی محبت

کے ساتھ قبول کیا ہے مثلاً احمد مشتاق کے ہاں ناصر کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔ اس نے بھی ناصر کی طرح دھیمے لہجے کو اپنایا اور "رات"، "شہر"، "قافلوں"، "چاند" اور "شہر جلنے" کی باتیں کی ہیں۔

رات بستر پہ کھلے چاند میں سوتا تھا کوئی میں نے چاہا کہ جگاؤں تو جگایا نہ گیا

ایک مدت اسے دیکھا، اسے چاہا لیکن وہ کبھی پاس سے گزرا تو بلایا نہ گیا!

سن اے ہر قدم پر ٹھہر جانے والے یہ سب قافلے ہیں گزر جانے والے

دلوں کو اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں میرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

احمد مشتاق کے علاوہ اسلم انصاری نے ناصر کاظمی کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ لہجہ، زبان اور اس قسم کے دوسرے حوالوں سے اسلم انصاری ناصر کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ اسلم انصاری کی یہ غزل پہلی نظر میں ناصر کی یاد دلاتی ہے۔

چاروں اور گھٹا چھائی ہے لیکن غم کی دھوپ وہی ہے

جیسے اس غمگین ہوا نے چپکے سے اک بات کہی ہے

کس کی آہٹ پا کر اب تک شام ایسے حیران کھڑی ہے

تھمتے تھمتے درد تھما ہے ڈھلتے ڈھلتے رات ڈھلی ہے

ہر جا سکھ کا کال پڑا ہے ہر من میں دکھ کی اگنی ہے!

گھر گھر کر برسی ہے بدلی! دھرتی پیاسی کی پیاسی ہے

پھر جانے والے یاد آئے پھر ساون کی رُت پلٹی ہے

اس نگری میں ہر چہرے پر
تنہائی کی گرد جمی ہے!

اس کے علاوہ یہ شعر دیکھئے:

مہیب راتوں میں ڈگمگاتے دکھی بدن کے مسافروں کو
اکیلے پن میں ڈرا رہی ہے سمے کے جنگل کی سائیں سائیں

یہ تو ناصر سے اگلی نسلوں کا معاملہ ہے، ناصر کی غزل میں اتنی توانائی بھی موجود ہے کہ اس کا نام فیض اور احمد ندیم قاسمی کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ فیض اور ندیم تجربے، شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے بھی بڑے شاعر ہیں مگر ناصر کا نام ان کے ساتھ آتے ہوئے کچھ الگ بھی ہو جاتا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ ناصر کی شناخت بہت دیر بعد ہوئی، ناصر جب اوّل اول شعری حلقوں میں متعارف ہوا، فیض اور ندیم اپنا مقام پیدا کر چکے تھے، مگر ناصر نے بڑی تیزی کے ساتھ وہی مقام حاصل کیا جو ان دونوں شعرا کے حصے میں آ چکا تھا...... فیض اور ندیم کے علاوہ فراق کو بھی ناصر کا ہم عصر قرار دیا جا سکتا ہے، اور فراق ناصر کو پسند بھی بہت تھا اور فراق کو عام طور پر بڑا غزل گو سمجھا جاتا ہے لیکن ناصر اور کسی حوالے سے ہو نہ ہو، زبان اور ڈکشن کے اعتبار سے فراق سے آگے ضرور ہے۔ فراق کے ہاں بعض اوقات ڈھیلے مصرعے ملتے ہیں، افتاں و خیزاں بحریں بھی ہیں، لفظ مقصود بالذات بھی ہو جاتے ہیں، لیکن ناصر نے اس انداز سے گریز کیا ہے۔ جس مخصوص لفظی ترتیب کو شاعری کہا جا سکتا ہے، وہ ناصر کے ہاں کمال درجے کی ہے۔ ہر لفظ کا ایک معنوی سیاق و سباق ہے جس کے بغیر لفظ کی حقیقی معنویت نہیں کھلتی۔

اردو غزل میں ناصر کے مقام کے تعین میں ان یادوں کا حوالہ بھی قابل ذکر ہے جو ناصر کی غزل کا ایک بڑا استعارہ ہے۔ ان یادوں کے پیچھے ایک پورا تہذیبی منظر ہے

جس کو ہجرت نے نظروں سے او جھل کر دیا تھا۔ یہ یادیں اقدار کے ان سلسلوں کے ساتھ مربوط ہیں جن سے محرومی نے ناصر کی غزل کو ایک واضح جہت عطا کی۔ انہی سلسلوں کی از سر نو دریافت، ان کی تشکیلِ نو اور معاشرے میں ان کو بروئے کار لانے کی خواہش ناصر کو مستقبل کے بعض خواب عطا کرتی ہے۔ وہ آنے والے زمانوں میں تعمیر کے وہ افق دیکھنا چاہتا ہے جو مدت سے احاطۂ نظر میں نہیں آئے، مستقبل کے خواب زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں، گرتے ہوئے لوگوں کو حسنِ عمل سے سنبھالا دینے کا عندیہ ظاہر کرتے ہیں مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ آواز کوئی روایتی انقلابی نعرہ یا اعلانِ بغاوت نہیں بلکہ ایک شاعر کا طرزِ احساس ہے۔

رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر

بے نشاں ہے سفر رات ساری پڑی ہے مگر
آ رہی ہے صدا دم بدم صبر کر صبر کر

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم صبر کر صبر کر

تیرے قدموں سے جاگیں گے اجڑے دلوں کے ختن
پا شکستہ غزالِ حرم صبر کر صبر کر

شہر اجڑے تو کیا ہے کشادہ زمینِ خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

یہ محلاتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کر صبر کر

دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم صبر کر صبر کر
پہلے کھل جائے دل کا کنول پھر لکھیں گے غزل!
کوئی دم اے صریرِ قلم صبر کر صبر کر!

ناصر کاظمی سے پہلے اردو غزل کی ایک بڑی توانا روایت نظر آتی ہے جس میں میر اور غالب جیسے بڑے بڑے شعرا کے بڑے شعری تجربوں کی جھلک ہے۔ اس میں حالی کی مقصدیت ہے اور داغ کی محاورہ بندی بھی، جگر کی سرمستیاں ہیں اور اصغر کا بیانِ تصوف بھی، حسرت کے لمسیات بھی ہیں اور فانی کا احساسِ نامرادی بھی، اقبال کی توانا آواز بھی اسی میں سنائی دیتی ہے اور یگانہ کی "غالب شکنی" بھی۔ فیض کے نرم نرم لہجے بھی ہیں اور فراق کا شعورِ حیات بھی۔ ندیم کی انسان دوستی کی جھلکیاں بھی اس میں لرزتی ہوئی نظر آتی ہیں...... ان کے علاوہ روایت کے اس سفر میں کتنے ہی شاعر ہیں جو موجود تو تھے لیکن زندہ نہ رہ سکے، ان میں کوئی انفرادی نقش نہیں تھا جو انہیں اعتبارِ حیات بخش دیتا، وہ تاریخِ شعر کا حصہ تو بلاشبہ ہیں لیکن روایتِ شعر کے سفر کے سنگِ میل قرار نہیں دیئے جاسکتے...... مگر ناصر کے پاس کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جن کے وسیلے سے وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے سامنے روایت کا وہ کھلا سمندر تھا جس کا ایک سرا ولی تھا اور دوسرا کنارہ وہ خود تھا...... اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس کھلے سمندر کو وارداتِ قلبی کی طرح محسوس کرتے ہوئے بھی خود پر طاری نہیں ہونے دیا۔ وہ خود کہتا ہے کہ:

"روایت کا مصرف یہی ہے کہ اس سے حرارت تو حاصل کی جاسکتی ہے، اس کے سائے میں ڈیرے نہیں ڈالے جا سکتے۔ جو کارواں اس الاؤ پر رہ پڑا اور اپنا الاؤ الگ نہ جلایا تو

پھر یہ الاؤ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا، جب اپنے پاس آگ
نہ ہو تو باہر کی آگ بھی حرارت نہیں پہنچاتی۔" (6)

ناصر روایت سے آگ حاصل کرنے کیلئے ضرور گیا ہے، لیکن اس نے اس سے اپنی الگ آگ بھی جلائی ہے، ویسے تو یوں بھی ہوا ہے کہ لوگ آگ لینے گئے تو کلیم بن کر لوٹے، ناصر کلیم تو نہ بن سکا کہ دنیائے شعر میں یہ مقام شاید اقبال کے لئے وقف تھا، لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ ناصر نے روایت کی آگ سے ایک نئی آگ جلائی ہے، ایک نیا شعلہ پیدا کیا ہے، اور ایک نئی آواز پیدا کی ہے جو "آتشیں نوا" نہیں تو کیا ہوا؟...... دل کی دھڑکن کی صدا تو ضرور ہے، جس نے اردو غزل کی روایت کو پیش قدمی کا راستہ دکھایا اور ڈوبتی اور مرتی غزل ناصر جیسے مسیحا کے ہاتھوں نئی زندگی کے تجربے سے روشناس ہوئی، جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناصر کی غزل زندہ رہنے والی آواز ہے۔ فراق، فیض، ندیم، انجم رومانی، شہرت بخاری، منیر نیازی، اور اس کے دیگر ہم عصر شعرا کے ہجوم میں انفرادی طور پر پہچانی جاتی ہے۔۔۔۔ یہ غزل ناصر کے الفاظ میں "اعتبارِ نغمہ" ہے کہ جس میں روایت کا اعتماد بھی ہے اور جدیدیت کے نئے ذائقے بھی۔۔۔۔ یہ وہی آواز ہے جو ہمارے ساتھ مانوس ہے، جسے ہم اپنا سمجھتے ہیں، جو چپ چاپ دلوں میں اتر جاتی ہے، اسی لئے تو ناصر نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔

زباں سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسے گا
نئے پیالے سہی تیرے دور میں ساقی
یہ دور میری شرابِ کہن کو ترسے گا

مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا

اس غریب الوطن کا سفر شہروں کے اجڑنے، قافلوں کے لٹنے اور اڑتی ہوئی خاک سے شروع ہوا تھا اور ساحلوں پہ گانے والوں اور کشتیاں چلانے والوں کے گم ہونے پر ختم ہوا۔ اول آشوب، آخر آشوب۔ اور درمیانی وقفہ انہی آشوبوں کی درد انگیز کہانی ہے، کہانی گو ناصر کاظمی ہے، جس کا ذہن حکایاتی ہے، اس نے کہانی شروع کی تھی تو اس وقت بھی رنجور قافلوں کا سفر تھا اور اس نے کہانی ختم کی تو اس وقت بھی لٹے پٹے قافلوں کے طویل سلسلے تھے۔ ہجرت اس کی غزل کا پہلا روشن معنوی سنگ میل تھی اور سقوط مشرقی پاکستان آخری بڑا المیہ۔ جس نے آخری بار اس کے لئے البرٹ وکٹر ہسپتال کے دروازے کھولے اور وہ "ماہی گیروں کی جنت" اور "جزیروں کی ٹھنڈی رات" کی باتیں کرتا کرتا زندگی کے ساحل کے اُس پار اتر گیا۔ آشوبوں کی یہ کہانی اس وقت تازہ تھی جب اس کا کہنے والا زندہ تھا اور اس کی تازگی تو اب بھی باقی ہے، جب وہ جا چکا ہے۔ اور اس کہانی میں اتنی جان ہے کہ وہ ماہ و سال کے سفرِ مسلسل کی شدتوں اور حدتوں کا ساتھ دے سکے۔ یقین ہے کہ مستقبل کا نقاد اور قاری اس کہانی میں ہر آن تازہ رہنے والی دلچسپی محسوس کرے گا، اردو غزل کے سفر میں جہاں جدید غزل کی بات ہو گی وہاں کوئی بات ناصر کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گی۔ اس کے رت جگوں کی یادوں کی طرح اس کی غزل بھی یاد رکھی جائے گی، وہ تو کہہ چکا کہ :

یوں تو تم روشنیٔ قلب و نظر ہو لیکن
آج وہ معجزہ دکھلاؤ کہ کچھ رات کٹے

اور پھر ناصر کی غزل میں یہ معجزہ تو ہے کہ اس کی مدد سے ایک رات نہیں، کئی راتیں کاٹی جا سکتی ہیں۔

حوالہ جات

1- ناصر کاظمی، "میرا ہم عصر" (مذاکرہ) ادبِ لطیف، نومبر 1962ء، ص 7

2- ناصر کاظمی، "میرا ہم عصر" (مذاکرہ) ادبِ لطیف، نومبر 1962ء، ص 7

3- ڈاکٹر عبادت بریلوی، "ایک غزل گو" ادبِ لطیف، سالنامہ 1961ء، ص 31

5- ناصر کاظمی، "اعتبارِ نغمہ" (دیباچہ برگِ نے)، ص 6

6- ناصر کاظمی، "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" (مذاکرہ) ماہِ نو، ستمبر 1954ء، ص 26

ماخذات اور کتابیات

نمبر شمار	مصنف / مولف	کتاب کا نام	شائع کردہ
1-	ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر	آج کا اردو ادب	فیروز سنز، لاہور
2-	"	غزل اور متغزلین	اردو مرکز، لاہور
3-	"	لکھنؤ کا دبستان شاعری	"
4-	احسن فاروقی، ڈاکٹر	فانی اور اس کی شاعری	مکتبۂ ماحول، کراچی
5-	احمد عقیل روبی	مجھے تو حیران کر گیا وہ	ورڈز آف وزڈم، لاہور
6-	احمد مشتاق	ہجر کی رات کا ستارا	نیا ادارہ، لاہور
7-	احمد ندیم قاسمی	جلال و جمال	"التحریر" لاہور
8-	"	شعلۂ گل	قومی دار الاشاعت، لاہور
9-	"	دشتِ وفا	کتاب نما، لاہور
10-	اقبال، علامہ	بانگِ درا	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
11-	"	بالِ جبریل	" "
12-	انیس ناگی	تنقیدِ شعر	میری لائبریری لاہور
13-	اے۔ وحید، ڈاکٹر	تذکرۂ جدید شعرائے اردو	فیروز سنز، لاہور
14-	جگر مراد آبادی	آتشِ گل	مکتبۂ شعر و ادب، لاہور
15-	"	شعلۂ طور	
16-	حالی، الطاف حسین	مقدمۂ شعر و شاعری	عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور
17-	حسرت موہانی	کلیاتِ حسرت موہانی	مکتبہ معین الادب، لاہور
18-	حسن رضوی، ڈاکٹر	وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

19-	حلقۂ اربابِ ذوق (مرتبہ انتظار حسین، ناصر الدین)	1963ء کے بہترین مقالے	مکتبۂ جدید، لاہور
20-	خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر	زاویۂ نگاہ	آدرش پبلشرز، پیراگی' گیا
21-	سجاد باقر رضوی	تیشۂ لفظ	کتابیات، لاہور
22-	سلیم احمد	ادھوری جدیدیت	سفینہ اکیڈمی، کراچی
23-	سلیم اختر، ڈاکٹر	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
24-	سہیل احمد خان، ڈاکٹر	طرزیں	قوسین، انار کلی لاہور
25-	سلیم اختر، ڈاکٹر	اقبال کا نفسیاتی مطالعہ	مکتبہ عالیہ، لاہور
26-	شمیم احمد	5 = 2 + 2	قلات پبلشرز، کوئٹہ
27-	شیخ صلاح الدین	ناصر کاظمی، ایک دھیان	مکتبۂ خیال، لاہور
28-	صدیق کلیم	فکرِ سخن	ارسلان پبلی کیشنز، لاہور
29-	عابد علی عابد	اصولِ انتقادِ ادبیات	مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور
30-	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	کلیاتِ میر (مرتبہ)	اردو دنیا، کراچی
31-	"	تنقیدی تجربے	"
32-	"	غزل اور مطالعۂ غزل	انجمن ترقیٔ اردو، کراچی
33-	"	روایت کی اہمیت	انجمنِ ترقیٔ اردو، کراچی
34-	"	جدید شاعری	اردو دنیا، کراچی
35-	عبدالحق مولوی، ڈاکٹر	انتخابِ داغ	اردو اکیڈمی، سندھ
36-	عبداللہ سید، ڈاکٹر	نقدِ میر	مکتبہ خیابان ادب، لاہور
37-	"	سخن ور (نئے اور پرانے)	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور
38-	"	اردو ادب (1857ء تا 1966ء)	مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور

39-	سید عبداللہ، ڈاکٹر	چند نئے اور پرانے شاعر	اردو مرکز، لاہور
40-	غالبؔ اسد اللہ خان	دیوانِ غالب	تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی
41-	فتح محمد ملک	تعصبات	مکتبۂ فنون، لاہور
42-	فراق گھورکھپوری	اندازے	مکتبہ فروغ اردو، لاہور
43-	فیض احمد فیض	دستِ صبا	مکتبۂ کارواں، لاہور
44-	"	نقشِ فریادی	"
45-	"	سرِ وادیٔ سینا	مکتبۂ دانیال، کراچی
46-	مقصود زاہدی، ڈاکٹر	یادوں کے سائے	کاروانِ ادب، ملتان صدر
47-	میراجی	تین رنگ	کتاب نما، راولپنڈی
48-	ن۔م۔راشد	ماورا	المثال، لاہور
49-	"	ایران میں اجنبی	"
50-	"	لا=انسان	"
51-	"	گماں کا ممکن	نیا ادارہ، لاہور
52-	ناصر کاظمی	برگِ نے	مکتبۂ کارواں، لاہور
53-	"	دیوان	پروگریسو پیپرز لمیٹڈ، لاہور
54-	"	پہلی بارش	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
55-	"	نشاطِ خواب	مکتبۂ خیال، لاہور
56-	"	امریکن سوسائٹی (ترجمہ)	اردو مرکز، لاہور
57-	"	غزل (فراق گورکھپوری)	نیا ادارہ، لاہور
58-	ناہید قاسمی	ناصر کاظمی، شخصیت اور فن	فضل حق اینڈ سنز، لاہور
59-	نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر	دلی کا دبستان شاعری	اردو اکیڈمی، سندھ
60-	وزیر آغا، ڈاکٹر	تنقید اور مجلسی تنقید	مکتبہ اردو زبان، سرگودھا

-61	وزیر آغا، ڈاکٹر	تنقید اور احتساب	جدید ناشرین، لاہور
-62	ہادی حسین	مغربی شعریات	مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور
-63	یوسف حسین خان، ڈاکٹر	اردو غزل	مکتبہ جامعہ، دھلی

اخبارات و رسائل

-64	"آفاق" روزنامہ، لاہور	3 جنوری 1955ء
-65	" "	17 جنوری 1955ء
-66	" "	7 فروری 1955ء
-67	ادبِ لطیف	سالنامہ 1961ء
-68	" "	اکتوبر 1962ء
-69	" "	نومبر 1962ء
-70	" "	فروری 1963ء
-71	" "	سالنامہ 1963ء
-72	ادبِ لطیف	سالنامہ 1964ء
-73	" "	جون 1964ء
-74	" "	فروری 1965ء
-75	" "	نومبر 1965ء
-76	امروز، روزنامہ، لاہور	19 مارچ 1972ء
-77	" "	7 اپریل 1978ء
-78	اوراق	انشائیہ اور افسانہ نمبر، مارچ، اپریل 1972ء

-79	اوراق	مارچ 1973ء
-80	"	جدید نظم نمبر (1977ء)
-81	خیابان	دسمبر 1964ء
-82	راوی	اپریل 1972ء
-83	سویرا	شمارہ 17`18
-84	"	شمارہ 19-20-21
-85	فنون	اپریل، مئی 1972ء
-86	"	جون، جولائی 1972ء
-87	"	اگست، ستمبر 1972ء
-88	"	اپریل، مئی 1973ء
-89	"	ستمبر، اکتوبر 1973ء
-90	"	جدید غزل نمبر (1969ء)
-91	لفظ	دسمبر 1972ء
-92	"	جنوری 1973ء
-93	"	جنوری 1974ء
-94	ماحول	شمارہ 7-8
-95	ماہِ نو	مئی 1954ء
-96	"	ستمبر 1954ء
-97	"	مارچ 1955ء
-98	"	جون 1977ء
-99	نقوش	مئی 1952ء
-100	"	شخصیات نمبر

101-	نقوش	جون 1960ء
102-	نگار	جدید شاعری نمبر
103-	"	حسرت موہانی نمبر
104-	"	سالنامہ 1967ء
105-	نیا دور	شمارہ 7-8
106-	نیرنگِ خیال	غزل نمبر (1969ء)
107-	نئی قدریں	نثر جدید نمبر، (نومبر 1966ء)
108-	"	شاعر نمبر (1967ء)
109-	ہمایوں	نومبر 1953ء
110-	"	اکتوبر 1955ء

تحقیقی و تنقیدی مقالے

111- "اردو غزل تقسیم کے بعد" (غیر مطبوعہ) از خالدہ اصغر،
پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

112- "ناصر کاظمی، شخصیت اور فن" (غیر مطبوعہ) از ناہید ندیم،
پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور
(یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے)

ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی
تاریخ پیدائش .... 14 نومبر 1955ء
تعلیم .... ایم اے اردو (بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان)
پی ایچ ڈی ایجوکیشن (بریڈفورڈ یونیورسٹی، برطانیہ)
پیشہ .... تدریس
ادارہ .... شعبۂ تعلیم، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
زیر طبع تصانیف .... Teachers and Higher Education in South Asia
یہ نئی بات نہیں (شعری مجموعہ)